
UNIVERSITY OF DELHI
निष्ठा धृति: सत्यम्

پُل پر

وِلڈر

شیر محمد اختر

ناجو

سنگم پبلشرز لمیٹڈ۔ لاہور

پُل پر

ملک پیرو میں ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ اُس قصبے کا نام لی ما ہے لی ما کے رہنے بسنے والوں کی زندگی جیسی بھی ہے۔ یہ قصہ اُس کی ایک جھلک ہے۔ ایک پل ٹوٹ گیا چند لوگ جو اس وقت پل عبور کر رہے تھے گر کر مر گئے۔ ایسا کیوں ہوا ؟ اس کا جواب پادری جیو پیٹر ہی دے سکتا ہے۔ یہ واقعہ اس کی آنکھوں کے سامنے ہوا۔ پل ٹوٹا اور چند لوگ مر گئے۔ پادری جیو پیٹر نے مرنے والوں کا کھوج لگایا۔ اُن کی زندگیوں کے حال معلوم کئے اور اسی چھان پھٹک میں ساری عمر جھونک دی۔ وہ یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ ہر کام اور ہر حادثے کی کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے۔ یہ قصہ اُسی کی جانی بوجھی باتوں کا خلاصہ ہے۔ پادری جیو پیٹر نے جس کام پر ہاتھ ڈالا تھا اس میں وہ کامیاب ہوا یا نہیں۔ اس کا اندازہ آپ ہی کریں

ایک حادثہ

بیس جولائی ۱۷۱۴ء، جمعہ کا روز اور دوپہر کا وقت تھا جب ملک پیرو کا سب سے نفیس اور عمدہ پُل ٹوٹا اور پانچ مسافر سر کے بل گہرے کھڈ میں گر کر ہلاک ہو گئے۔ یہ پُل لی ما اور کزکو کے درمیان آنے جانے والی جرنیلی سڑک پر واقع تھا۔ ہر روز سیکڑوں لوگ اس کے اوپر سے گذرتے۔ ایک صدی گذری جب پیرو کے حکمران خاندان میں سے کسی نے اُسے بید کی ٹہنیوں سے بنوا کر وہاں لگوایا تھا۔ جو شخص بھی اس جگہ آتا وہ اس عجیب و غریب پُل کو ضرور دیکھتا۔ یہ محض ایک طرح کی سیڑھی تھی جس میں پتھر کی سلیٹیں لگی تھیں اور جسے گہرے کھڈ کے اوپر بچھا دیا گیا تھا۔ سہارے کے لئے دونوں طرف انگور کی خشک بیلوں کے رسے بندھے تھے جنہیں پکڑ کر لوگ پار جاتے۔ گھوڑے، بگھیاں اور پالکیاں سب کئی سو فٹ نیچے بہتی ہوئی ندی پر کشتیوں کے بیڑے سے گذرتی تھیں۔ اس پُل پر سے نہ صرف عوام بلکہ وائسرائے اور لی ما کا لاٹ پادری بھی گذرا کرتے۔ ان کا لاؤ لشکر نچلے راستے سے جاتا اور وہ خود اوپر سے۔ فرانس کا مشہور ولی ”سینٹ لوئس“ اس پُل کا محافظ تھا۔ چنانچہ اُسی کے نام پر اس پل کا نام ”سان لوئی رے کا پُل“ رکھا گیا۔ پُل کے پاس مٹی کا ایک گرجا بھی اُسی کی یاد میں بنایا گیا تھا۔ یہ

پل ان چیزوں میں سے سمجھا جاتا تھا جنہیں دوام حاصل ہے۔ خواب میں بھی کسی کو یہ خیال نہ آتا تھا کہ یہ پل ٹوٹ جائے گا۔ پیرو کے ایک باشندے نے جونہی اس کے ٹوٹنے کی خبر سنی اس نے فوراً صلیب کا نشان بنایا اور سوچنے لگا کہ کس طرح ابھی ابھی اس نے خود پل عبور کیا تھا اور جلد ہی اس راستے سے واپس جانے کا ارادہ کر رہا تھا جس نے بھی یہ واقعہ سنا۔ اس پر سکتے کا عالم طاری ہو گیا۔ وہ بڑبڑانے لگتا اور اُسے وہم سا ہونے لگتا۔ کہ وہ خود ایک گہرے کھڈ میں گرا جا رہا ہے۔

بڑے گرجا میں وسیع پیمانے پر دعا کا انتظام کیا گیا۔ ہلاک ہونے والوں کی لاشوں کو اندازاً اکٹھا کیا گیا اور اندازاً ہی ایک دوسرے سے جدا کیا گیا۔ لی ما کے خوبصورت شہر میں ہر کوئی اپنا واپس لوٹنے لگا۔ خادماؤں نے وہ سارے چھوٹے موٹے زیورات جو انھوں نے اپنی مالکنوں کے ہاں سے چرائے تھے واپس کر دیئے۔ سود خوار ناراض ہو کر اپنی بیویوں کے سامنے سود کی حمایت میں خطبے دینے لگے۔ حیرانی کی بات یہ ہے۔ کہ اس واقعہ نے لی ما کے رہنے والوں پر کیوں کر ایسا گہرا اثر کیا۔ اس ملک میں ایسی ایسی آفتیں اکثر نازل ہوا کرتی تھیں۔ قانون داں لوگ ان مصیبتوں کو خدا کے کام کہتے تھے۔ طوفانی لہریں ہمیشہ اُن کے شہروں کو بہا لے جاتیں۔ ہر ہفتے ایک نہ ایک بار زلزلہ آتا اور شہروں کے اونچے اونچے مینار زمین پر آ رہتے۔ یہی نہیں بلکہ بہت

سے نیک مرد اور عورتیں ان کے نیچے دب کر مر جاتیں۔ ہماری سارے ملک میں پھیلی رہتی۔ اور بڑھاپا بہت سے نامور شہریوں کو چھین کر لے جاتا۔ پیرو کے لوگ ان مصیبتوں اور تکلیفوں کے عادی ہو چکے تھے لیکن کیسی حیرت کی بات ہے کہ جب "سان لوئی رے کا پل" ٹوٹا تو وہی لوگ اس واقعہ سے بہت متاثر ہوئے۔

کہنے کو تو ہر کوئی اس واقعہ سے گہرے طور پر متاثر ہوا لیکن ایک شخص تھا جس نے اس واقعہ کی طرف پوری توجہ دی۔ وہ شخص پادری جیوپیٹر تھا۔ پادری جیوپیٹر چھوٹے قد کا آدمی تھا۔ اُس کے سر کے بال سُرخ تھے۔ اصل میں وہ شمالی اٹلی کا رہنے والا تھا لیکن مقامی لوگوں میں عیسائیت کا پرچار کرنے کے لئے اُن دنوں پیرو آیا ہوا تھا۔ حسنِ اتفاق دیکھئے وہ کہاں سے کہاں آ پہنچا "سان لوئی رے کا پل" اس کے دیکھتے دیکھتے ٹوٹا۔

اس دن دوپہر کو سخت گرمی تھی ——— ناقابل برداشت گرمی' راہب جیوپیٹر چلتے چلتے ایک پہاڑی کے دامن میں پسینہ پونچھنے کے لئے رُکا اس کے سامنے پہاڑیاں تھیں جن کی چوٹیاں برف سے ڈھکی تھیں۔ نیچے ایک گہرا کھڈ تھا۔ کھڈ میں ہرے بھرے درخت اُگے تھے اور ان درختوں پر رنگا رنگ پرندے چہچہا رہے تھے۔ کبھی اُڑ کر پُل پر آ بیٹھتے اور کبھی درختوں پر چلے جاتے۔ یہ سماں دیکھ کر جیوپیٹر خوشی سے بھر گیا۔ اس کا کام بھی اس کی مرضی

کے مطابق ہو گیا تھا۔ اس نے کئی بند گرجے پھر سے جاری کر دیئے تھے۔ پیرو کے باشندے اس کی نمازیں جوق در جوق آتے تھے۔ اور اس طرح دھیان میں ڈوب کر دعائیں کرتے۔ گویا ان کے دل پگھلے جا رہے ہیں۔ شاید یہ تازہ برفیلی ہوا کا اثر تھا جو ان پہاڑیوں کی طرف سے آ رہی تھی۔ یا شاید اس نظم کی یاد تھی جسے گنگناتے ہوئے اس نے پہاڑیوں کی جانب نگاہ اٹھائی تھی۔ بہر حال وہاں کھڑے کھڑے اس نے سکون محسوس کیا۔ اچانک اس کی نگاہ پل پر جا رکی اور عین اسی وقت ساری فضا دردناک صداؤں سے بھر گئی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے یک بیک کسی خالی کمرے میں ساز کے تار ٹوٹ جائیں اور ان سے ایک پُرسوز لَے پیدا ہو۔ اس کے دیکھتے دیکھتے پل دو ٹکڑے ہو گیا اور پانچ چیونٹیاں سی چیختی چلاتی، ہاتھ پیر مارتی وادی کی گہرائیوں میں گم ہو گئیں ۔۔۔۔۔۔

اگر کوئی اور ہوتا تو وہ دل ہی دل میں خوش ہو کر کہتا "مجھ سے دس منٹ پہلے ایسا ہوا کہ ۔۔۔۔۔۔" لیکن پادری جیو پیٹر کے دماغ میں کچھ اور ہی خیال تھا ۔۔۔ "یہ حادثہ صرف ان پانچ انسانوں کو کیوں پیش آیا؟" اگر کائنات میں کوئی نظام کارفرما ہے اگر انسانی زندگی کسی نظام کے ماتحت ہے تو ان پانچ زندگیوں کا یوں ایکا ایکی باقی لوگوں سے کٹ جانا ضرور کسی مخفی ارادے کے مطابق ہے۔ ہماری زندگی یا موت یا تو محض ایک اتفاق ہے یا ہم کسی نظام کے ماتحت زندہ رہتے اور مرتے ہیں۔ چنانچہ جیو پیٹر نے وہیں تہیہ کر لیا کہ وہ ان

پانچ انسانوں کی زندگی کے مخفی راز معلوم کرنے کی کوشش کرے گا —— آخر وہ کیوں دوسروں سے چھین لئے گئے؟

پادری جیونپر کو خیال پیدا ہوا کہ اب وقت آگیا ہے۔ جب دینیات کو بھی دوسری سائنسوں کی طرح قطعی ہونا چاہیئے۔ ایک مدت سے اُسے یہ لگن لگی تھی کہ کون وقت ہو اور وہ ثابت کرے کہ مذہب بھی ایک سائنس ہے قطعی اور حقیقت سے بھرپور۔ وہ اپنے نظریہ کے لئے کام کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اُسے تجربہ گاہ نہ ملتی تھی۔ آئے دن ایسے واقعات ہوتے رہتے تھے جن سے اس کے نظریہ کی تائید ہوتی تھی۔ کیڑے مکوڑے انسانوں کو کاٹ کھاتے انسانوں کے جسموں میں بس بھر جاتا اور وہ مرجاتے۔ بنے سجے مکانوں کو آگ لگ جاتی اور وہ راکھ ہو جاتے۔ بچے بوڑھے طرح طرح کی تکلیفوں کا شکار ہوتے انسانی آلام کے ان واقعات کا سائنس کے ذریعے تجزیہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے بزرگ و لی جیسا کہ کہا کرتے ہیں ایسے حادثات میں کسی بات کی کمی رہ جاتی ہے حادثہ کسی انسانی غلطی کی وجہ سے ہوتا ہے یا اس میں ممکنات کا کچھ پہلو رہ جاتا ہے۔ لیکن "سان لوئی رے پل" کا یوں ایکا ایکی ٹوٹ جانا تو سراسر "خدا کی مرضی" کا ایک کرشمہ تھا اور یہ بجائے خود ایک تجربہ گاہ تھی جہاں ایک شخص خدائی منشا کا مطالعہ کھلے طور پر کرسکتا تھا۔

آپ اور میں خوب جانتے ہیں کہ پادری جیونپر کی طرف سے اس

باتوں کا اظہار صریحاً شک پرستی تھی۔ اس کا یہ خیال بالکل ان گستاخ لوگوں کی مانند تھا جنہوں نے بہشت کے راستے پر گامزن ہونے کے لئے بابل کے مینار تعمیر کئے۔ لیکن ہمارے اس درویش صفت پادری کے تجربے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہ تھا۔ وہ ہر سوال کا جواب جانتا تھا۔ وہ اپنی بات کو ثابت کرنا چاہتا تھا۔ تاریخی طور پر ریاضی کے ذریعہ۔ وہ اپنے نو عیسائیوں کو جو کچھ قدیم واقف ہوئے تھے اور بات ذرا دیر سے سمجھتے تھے بتانا چاہتا تھا کہ ان کی زندگی میں وہ کچھ خود ان کی بہتری کے لئے ہے۔ لوگ اس کے متعلق ثبوت مانگتے ہیں۔ بس ان کے سینے میں شک ہمیشہ رونما ہوتا رہتا۔ نئے تجربہ کر بیٹھے ہیں جہاں کی مذہبی عداوتیں لوگوں کی آنکھیں دیکھ کر ان نئے خیالات کا پیدا ہونا لگتی ہیں۔ لیکن شک وہاں بھی موجود ہے۔

یہ پہلی بار تھا کہ جیوپیٹر نے ایسا طریقہ اختیار کیا ہو۔ اکثر اپنے سے نیچے دور دراز بیابان راستے سے ایک گرجے سے دوسرے گرجے تک جانا پڑتا اور وہ گھٹنوں تک اپنا لبادہ اٹھائے تیز تیز چلا کرتا۔ پھر وہ گہری سوچ میں ڈوبا رہتا۔ وہ خدا کے ہر کام میں حکمت ثابت کرنے کے لئے تجربات کرنا چاہتا تھا۔ وہ اکثر بارش کی دعاؤں پر غور کیا کرتا اور پھر ان کے نتیجوں کو بھی دیکھتا۔ اکثر وہ کسی گرجے کی سیڑھیوں پر کھڑا ہو جاتا۔ اس کے سامنے انسانوں کی ایک جماعت جھکی ہوتی۔ وہ دونوں ہاتھ آسمان کی طرف بلند کر کے

بڑے جوش سے بارش کے لئے دعا مانگتا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ اُسے اپنے آپ میں کسی
آسمانی طاقت کے حلول کا احساس ہونے لگا۔ اور پھر اس کے بعد گویا افق پر بادل
نمودار ہو گئے۔ لیکن بارہا کئی کئی ہفتے گزر جاتے کہ ...... لیکن ان کا ذکر ہی کیا؟
اُسے اپنے آپ کو یقین دلانے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ تو دوسروں کو سمجھانا چاہتا تھا
کہ بارش کے ہونے یا نہ ہونے میں ضرور کوئی خدائی بات ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ
حادثہ دیکھتے ہی اس کے دل میں یہ ارادہ پیدا ہوا جس نے اُسے چھ برس لگاتار کام میں
لگائے رکھا۔ اس دوران میں اس نے لی ما کا ایک ایک دروازہ کھٹکھٹایا۔ ہزاروں
سوالات پوچھے۔ بیسیوں نوٹ بکیں سیاہ کر ڈالیں۔ وہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ پانچوں
ہلاک ہونے والوں میں سے ہر ایک کی زندگی بجائے خود مکمل تھی ....
بی! یہ باتیں سے پیچھے رہے۔ تھے۔ وہ اس حادثہ کی یادگار میں کوئی مواد اکٹھا کر رہا
ہے۔ اس لئے یہ لوگ بھی بہت مفید اور لطیف اوقات غلط اطلاع دیتے تھے۔ بعض
لوگ ایسے بھی تھے جو اس کی اس سرگرمی سے واقف تھے۔ اونچے طبقے کے لوگوں
میں سے بعض نے اس کی سرپرستی بھی کی۔

اس کی ساری محنت کا نتیجہ ایک ضخیم کتاب تھی جس کا ذکر ہم آگے کریں گے
جو بہار کی ایک صبح یہ کتاب بڑے جوش میں جلا دی گئی۔ اس کتاب کی ایک جلد کسی
طرح بچی رہی اور گھومتے ہوتے یہ کتاب سان مارٹن کی یونیورسٹی لائبریری میں پہنچ گئی
جہاں اب تک وہ لکڑی کے دو تختوں کے درمیان گرد سے اٹی پڑی ہے۔ اس

کتاب میں ہر ایک ہلاک ہونے والے کے متعلق چھوٹے چھوٹے واقعات تفصیل سے درج ہیں۔ ہزاروں باتیں اور شہادتیں لکھی ہیں اور آخر میں نتیجے کے طور ایک بیان شامل ہے کہ خدا نے خاص دن اور خاص وقت پر ایک آدمی کو کیوں ہلاک کیا؟ اس میں خدا کی کیا حکمت پوشیدہ تھی؟ لیکن اس محنت اور تن دہی کے باوجود پادری جیو پیٹر ——— خاتون ماریا، چاچا پیٹو اور ایس تے پان کی ہلاکت کے متعلق خدائی مصلحت کو نہ جان سکا۔ مجھے پادری سے زیادہ معلومات رکھنے کا دعویٰ ہے لیکن میں بھی نہیں کہہ سکتا کہ میں نے اس مصلحت کو پالیا ہے یا نہیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہم اس بارے میں کبھی کچھ نہیں جان سکتے دیوتاؤں کے سامنے ہم انسان کیا ہیں ——— حقیر مکھیاں، جنہیں بچے مارتے پھرتے ہیں۔ مگر اس کے خلاف یہ بھی تو ہے کہ خدا کی مرضی کے بغیر ایک پتہ بھی نہیں گرتا۔

خاتون ماریا اوریلی پیتیا

آج اسپین کا ہر ایک طالب علم خاتون ماریا کے متعلق اس سے بہت زیادہ جانتا ہے جس قدر جیو پرڈ کو اپنی تحقیقات کے دوران میں علم ہوا تھا۔ خاتون ماریا کی موت کو ابھی ایک صدی گذری ہو گی لیکن اس کے خطوط ہسپانوی ادب میں ایک یادگار بن گئے ہیں اور اس کی زندگی اور اس کا زمانہ تحقیقات کا موضوع بن چکا ہے۔ اس کے سوانح نگاروں نے ایک بہت بڑی غلطی کی ہے بالکل اسی طرح جیسے درویش صفت پادری نے کی تھی۔ اُس نے اگر زندگی کا ایک رُخ دیکھا تو ان سوانح نگاروں نے دوسرا رُخ۔ ان لوگوں نے اس عورت کی زندگی کے گرد شرافت کا ایک جال بن دیا۔ اس کے خطوط میں جس حسن و جمال کا ذکر تھا ان لوگوں نے یہی حسن اس کی ذات سے وابستہ کر دیا حالانکہ اس عجیب و غریب خاتون کے بارے میں اصل حالات کا علم تب ہو سکتا ہے کہ ہم اُسے اس کے افعال کی روشنی میں دیکھیں اور باقی باتیں اس سے الگ کر دیں۔

وہ ایک بزاز کی بیٹی تھی۔ یہ شخص اگرچہ کافی مالدار تھا مگر سارا لی ماس سے نفرت کرتا۔ اس کا بچپن رنج و غم میں گذرا۔ وہ بدصورت تھی۔ باتیں کرتے کرتے ہکلانے لگتی۔ اس کی ماں ذرا ذرا سی بات پر اُسے سزا دیتی۔ اس پر طنز کرتی۔ ماں چاہتی

تھی کہ اس کی بیٹی ایسی ادائیں سیکھ لے جن سے وہ سماج میں مقبول ہو۔ وہ اُسے مجبور کرتی کہ وہ نئے نئے کپڑے اور زیورات پہن کر شہر میں گھومنے جائے۔ لیکن یہ لڑکی اکیلا رہنا پسند کرتی اور اکیلے بیٹھی سوچا کرتی۔ بہت سے لوگ اس سے بیاہ کرنے کے خواہشمند تھے۔ انہوں نے پیغامات بھیجے مگر وہ انکار کرتی رہی۔ وہ اکیلا رہنا چاہتی تھی۔ اس نے زمانے کے رواج کی بھی پروا نہ کی اور اپنی ضد پہ قائم رہی۔ کئی بار ماں بیٹیوں میں تُو تُو میں کی نوبت آجاتی۔ ماں کی ڈانٹ ڈپٹ، لڑکی کی چیخیں اور بالآخر دروازے بند ہونے کی آوازوں پر معاملہ ختم ہوتا۔

آخرکار جب وہ چھبیس برس کی ہوگئی۔ تو والدین نے اُسے زبردستی ایک متکبر اور تباہ حال امیر کے ساتھ بیاہ دیا۔ لی ما کے بڑے گرجا میں مہمانوں کی کثرت کا نظارہ قابل دید تھا۔ شادی کے بعد بھی وہ اکیلی ہی رہتی۔ اکیلے میں سوچتی اور پھر جب اس کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی تو وہ اس بچی سے بے پناہ محبت کرنے لگی۔ اس کا پیار بیت پرستی کی حد تک جا پہنچا۔

یہ بچی کلارا اپنے باپ سے بہت ملتی جلتی تھی۔ بلکہ اُسی کی طرح سرد اور ذہین تھی۔ جب کلارا آٹھ برس کی ہوئی تو وہ بات چیت کے دوران میں اپنی ماں کو ٹوک دیتی، اور کہتی ——— "ماں تمہیں بولنا ہی ہے تو صحیح الفاظ بولو"۔ پھر کبھی کبھی حیرانی اور نفرت سے ماں کا منہ تکنے لگتی۔ ماں بیچاری ڈر جاتی۔ بیٹی کے سامنے

مسکین بن جاتی۔ خوشامدیں کرتی۔ مگر اس کے باوجود وہ اپنی مامتا کے ہاتھوں مجبور تھی۔ اس کی ساری توجہ اپنی بیٹی پر مرکوز تھی۔ یہ توجہ بیٹی کے لئے ایک عذاب بن گئی۔ اُسے دکھ ہوتا۔ اس کا نتیجہ بھی وہی ہوا۔ ماں بیٹی میں لڑائی ہوتی طعن و تشنیع چیخنا چلانا ہوتا اور آخر میں دروازے بند ہو جاتے۔

جب کلارا جوان ہوئی تو اُسے شادی کے پیغامات آنے لگے۔ بڑی سوچ بچار کے بعد اُس نے ایک ایسے شخص کو قبول کر لیا جو اُسے فوراً اسپین لے جا سکتا تھا۔ چنانچہ وہ اسپین چلی گئی۔ یہ ملک لی ماں سے اتنی دُور تھا کہ وہاں سے خط کا جواب آتے آتے چھ ماہ گذر جاتے۔ پیرو میں رخصتانے کی سماں بھی عجیب ہوتا تھا۔ اس کے لئے گرجا گھر میں خاص نماز کا اہتمام کیا جاتا۔ جہاز کو برکت دینے کی رسم ادا کی جاتی۔ اور جوں جوں جہاز کنارے سے دور ہوتا جاتا دولہا طرف کے لوگ گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر حمد کا ترانہ پڑھتے۔ اس ترانے کی آواز کھلی فضائیں گونجتی رہتی اور مدھم نہ پڑتی۔ خاتون کلارا نے اپنے رخصتانہ کے وقت نہایت سکون کا اظہار کیا۔ بے چاری ماں دور تک بیٹی کا راہ تکتی رہی۔ اس کا ہاتھ بار بار اُٹھتا کبھی دل پر آتا اور کبھی منہ پر۔ پھر سمندر کی لہروں نے جہاز کو دھندلا دیا۔ بادلوں کے بڑے بڑے ٹکڑے اس کے سامنے چھا گئے۔

اب لی ماں خاتون ماریا اکیلی رہ گئی تھی۔ اس کی طبیعت پہلے سے زیادہ تنہائی پسند ہو گئی، اس نے اپنے آپ کو بالکل بھلا دیا۔ لباس کی طرف اس نے

توجہ دینا چھوڑ دی۔ اور بیٹھے بیٹھے اونچی آواز میں آپ سے آپ باتیں کرنے لگتی
اس کی زندگی کا سارا انحصار دماغ کے اس حصے پر رہ گیا تھا۔ جو ہر وقت سُلگتا
رہتا۔ دماغ کے اس حصّے کے اسٹیج پر نہ ختم ہونے والے مکالمات کیے جاتے
جن کی مخاطب اس کی بیٹی تھی۔ اور پھر اسی طرح خیال ہی خیال میں صلح ہو جاتی۔ وہ
خود ہی اپنی بیٹی سے معذرت خواہ ہوتی اور خود ہی اس کی خطائیں معاف کر دیتی
راہ چلتے ایک بوڑھی خاتون اکثر نظر آتی تھی۔ سرخ بالوں کی مصنوعی ٹوپی ایک
کان پر جھکی ہوتی۔ بائیں رخسار پر غصے کا اظہار اور دایاں گال گلگونہ سے زیادہ سرخ
بائیں کی کسی پوری کر رہا ہوتا۔ اس کی ٹھوڑی کبھی خشک نہ ہوتی اور اس کے لب
ہمیشہ ہلتے رہتے تھے۔ ویسے تو لی ما کے شہر میں سارے ہی سنکی لوگ بستے تھے
لیکن یہ خاتون اُن میں بھی نرالی وضع کی تھی۔ جب بازار میں سے اس کی سواری
گذرتی، یا وہ گرجا کی سیڑھیاں چڑھ رہی ہوتی تو لوگ اُسے دیکھنے لگتے۔ اُن کا
خیال تھا کہ خاتون ماریا ہر وقت نشے میں رہتی ہے۔ اس کے متعلق اور بھی
عجیب و غریب باتیں کہی جاتی تھیں اور پھر نوبت یہاں تک پہنچی کہ لوگوں نے
درخواستیں گذاریں کہ اس بڑھیا کو پاگل خانہ بھیج دیا جائے، تین بار مذہبی عدالت
نے اُسے مجرم ٹھہرایا۔ اگر اس کے داماد کا سپین میں زیادہ اثر رسوخ نہ ہوتا تو
شاید اس کو زندہ جلا بھی دیا جاتا۔ پھر وائسرائے کے دربار کے چند لوگ اس کے
ہمدرد ثابت ہوئے۔ انہوں نے اس کے اس انوکھے پن اور کافی مطالعہ کی وجہ

سے اُسے بچا لیا۔

ماں اور بیٹی کے تعلقات کشیدہ تو تھے ہی مگر روپے پیسے کی وجہ سے اور بھی زیادہ کشیدہ ہو گئے۔ کلارا کو ماں ایک معقول رقم خرچ کے لئے بھیجا کرتی تھی اس کے علاوہ تحفے تحائف بھی ہوتے۔ خاتون کلارا نے اسپین کے شاہی دربار میں اپنی ذہانت کی وجہ سے کافی رسوخ حاصل کر لیا۔ مگر پیرو سے جس قدر روپیہ اُس کی ماں اُسے بھیجتی وہ درباری زندگی کے اخراجات کا کفیل نہ ہو سکتا کیونکہ اپنے مرتبے کے لحاظ سے اُسے کافی سے زیادہ خرچ کرنا پڑتا۔

اُدھر ماں کی طبیعت میں ایک نیا جذبہ بیدار ہوا۔ اُس نے بھی دولت خرچ کرنے کا طریقہ ڈھونڈا۔ وہ اپنے تمام دوستوں، خادموں اور دوسرے دلچسپ لوگوں کو اپنا بچہ خیال کرنے لگی۔ دنیا میں صرف ایک ہی فرد تھا جس کے لئے اس کا دل تنگ ہو رہا تھا۔ ورنہ اس کا دستِ کرم سب کے لئے کھلا تھا۔ اس کے پروردہ لوگوں میں سے ایک شخص دی بلاتسیس تھا۔ یہ نقشہ نگار تھا (اس نے جب لی ما کے دربار میں نئی دنیا کا نقشہ پیش کرتے ہوئے اُسے خاتون ماریا کے نام معنون کیا، تو سارا دربار تالیوں سے گونج اُٹھا۔ نقشہ نگار نے اُسے "شہر کی قابلِ فخر ہستی اور مغرب کا طلوع ہوتا ہوا سورج" قرار دیا) سائنس دان ازورس کی بھی اُس نے بہت مدد کی۔ اس نے جب آب رسانی کے قوانین پر مقالات لکھے تو مذہبی عدالت نے اُسے روک دیا۔ کیونکہ اس عدالت کے

نزدیک یہ مقالات سنسنی خیز تھے۔ برسوں اس خاتون نے اسپین کے آرٹ اور سائنس کی سرپرستی فرمائی۔ اب یہ اس کا قصور تھوڑا ہے کہ اس زمانے میں کوئی قابل قدر چیز پیدا نہ ہوئی جو بطور یادگار باقی رہ سکتی۔

خاتون کلارا کے رخصتانہ کے چار برس بعد خاتون ماریا کو بھی یورپ جانے کی اجازت مل گئی۔ اب دونو جانب اس کی تیاریاں ہونے لگیں۔ ماں بیٹی دونو نے تہیہ کر لیا کہ اُن کی یہ ملاقات بدلے ہوئے حالات میں ہوگی۔ ماں صبر سے کام لے گی اور بیٹی کسی قسم کا مظاہرہ نہ کرے گی۔ لیکن دونو ہی ناکام رہیں۔ ایک نے دوسرے کو اذیت پہنچائی۔ اُن کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ دونو اپنی اپنی جگہ عذاب میں مبتلا ہو گئیں۔ اس کا اظہار ایک طرف سے تو یوں ہوا کہ ماں اپنے آپ کو بُرا بھلا کہہ لیتی اور بیٹی جذبات سے مجبور ہو کر پھوٹ پڑتی۔ آخرکار ایک دن خاتون ماریا صبح سویرے اٹھی۔ بے چاری بیٹی کے کمرے کی طرف بڑھی جو اندر سو رہی تھی۔ اُس نے ڈرتے ڈرتے دروازہ چوما اور جہاز کے ذریعے امریکہ لوٹ آئی۔ اس کے بعد ماں کی ساری ممتا الفاظ کا جامہ پہن کر خطوط میں منتقل ہونے لگی۔

ایک زمانہ آیا جب اس خاتون کے یہ خطوط دنیا کو حیران کرنے لگے۔ انہیں سکولوں میں درسی کتابوں کے طور پر پڑھایا جانے لگا۔ صرفی نحویوں نے ان پر بے شمار کتابیں لکھ ڈالیں۔ خاتون ماریا ذہین پیدا ہوئی تھی۔ ورنہ اگر ذہین نہ بھی ہوتی تو وہ ضرور ذہانت ایجاد کر لیتی۔ کیونکہ اس کی اس ممتا کے لئے ذہانت

کا ہونا ضروری تھا تاکہ اس کے ذریعے وہ اپنی بیٹی کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا سکے، پھر اس نے اپنے تئیں مجبور کیا اور سوسائٹی میں آنے جانے لگی۔ وہ چاہتی تھی کہ سماج کی مضحکہ خیزیوں کا انتخاب کر سکے۔ اس نے اپنی نگاہوں کو مشاہدہ کرنا سکھایا۔ وہ اپنے ادب کے شاہکاروں کا مطالعہ کرنے لگی تاکہ ان کے تاثر کو جان سکے۔ اس نے ان لوگوں سے رابطہ بڑھایا، جو اپنی شیریں مقالی کے باعث سماج میں مقبول تھے۔ وہ اپنے نادر محل میں راتوں بیٹھی حیرت انگیز صفحات لکھتی، پھاڑتی اور پھر لکھتی رہتی۔ وہ کاغذ پر انمول موتی بکھیر رہی تھی۔ جن میں نکتہ سنجی بھی تھی اور شوکت الفاظ بھی۔ یہ تحریریں اس زمانے کے وائسرائے کے دربار کے حالات کا ایک مرقع ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ بیٹی نے کبھی ان خطوط کو دیکھنے کی بھی تکلیف گوارا نہ کی۔ ہمیں اس کے داماد کی مہربانی کا ممنون ہونا چاہیئے جس کی وجہ سے یہ خطوط محفوظ رہے۔

اگر خاتون ماریا کو یہ علم ہو جاتا کہ اس کے یہ خطوط غیر فانی ہو جائیں گے تو وہ خود حیران رہ جاتی۔ لیکن بہت سے نقادوں نے اس پر الزام لگایا ہے کہ یہ خطوط لکھتے وقت اس کے ذہن میں ایک طرف تو آنے والی نسلوں کا خیال تھا۔ دوسری طرف وہ اپنی قابلیت کے جوہر دکھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ان نقادوں کے نزدیک یہ بالکل ممکن نہیں کہ وہ اپنی بیٹی کو ان الفاظ سے حیران کر رہی تھی جس طرح بہت سے فن کار اپنے فن کے ذریعے عوام کو حیران کرتے

ہیں۔ انہوں نے بھی اُس کے داماد کی طرح اُسے غلط سمجھا۔ وہ ان خطوط سے لطف اندوز تو ضرور ہوتا۔ لیکن اس نے سوچا کہ جب وہ طرزِ نگارش سے بہرہ ور ہو جاتا ہے تو گویا وہ ان خطوط کی ساری لطافت اور ان کا مقصد پا لیتا ہے۔ اور یوں وہ (عام پڑھنے والوں کی طرح) ادب کا سارا مفہوم خبط کر دیتا۔ حالانکہ یہی مفہوم دل کی ساری حقیقت ہے۔ طرزِ نگارش تو ایک جام ہے جس میں کڑوی چیز بھی دنیا والوں کو بھلی معلوم ہوتی ہے۔ خاتون ماریا خود بھی حیران ہو جاتی اگر وہ جانتی کہ اس کے خطوط اتنے اچھے تھے۔ بات در اصل یہ ہے کہ ایسے مصنفین اپنی دھن میں ہی مگن رہتے ہیں اور وہ شہ پارے جنہیں شہرت دوام حاصل ہے اُن کے معمول کی تحریر بن جاتی ہے۔

یہ بوڑھی خاتون گھنٹوں بنجارچہ میں بیٹھی رہتی۔ اس کا نیلیوں کا ٹوپ اس کے زرد اور جھریوں والے چہرے پر اداسا یہ ڈالتا رہتا۔ مطالعہ کرتے وقت جب وہ اپنی مرصع انگلیوں سے ورق گردانی کرتی تو اس کے دل میں ایک عجیب سوال پیدا ہوتا۔ کیا وہ درد جو اس کے دل میں تھا اب کبھی دور نہ ہوگا۔ وہ کبھی کبھی یہ سوچ کر حیران ہوا کرتی کہ اگر کوئی ڈاکٹر اس کا دل چاک کر کے دیکھے۔ تو کیا وہ اپنے طالب علموں کو کہہ سکے گا کہ "یہ عورت بیچاری عمر بھر دکھ سہتی رہی ہے اور دیکھو دکھ کے نشان اس کے دل پر موجود ہیں"۔ چنانچہ یہ خیال ایک مدت تک اس کے دماغ پر حاوی رہا اور بالآخر اُس نے اپنی بیٹی کو یہی یہ لکھ دیا۔ اس

کے جواب میں اس کی بیٹی نے اُسے ڈانٹ بتائی اور لکھا کہ تمہاری یہ دل کا حال جان لینے والی باتیں سراسر فضول اور خواہ مخواہ کی غم پرستی ہیں۔

جب اُسے اس بات کا یقین ہو گیا کہ اُسے محبت کا جواب کبھی محبت میں نہیں مل سکتا تو وہ خاموش ہو گئی۔ وہ اس چٹان کی مانند تھی جس سے پانی کی لہریں ٹکرا کر لوٹ جاتی ہیں۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ اس کے مذہبی خیالات کا شیرازہ بکھر گیا۔ وہ دیوتاؤں سے صرف اتنا ہی مانگتی تھی کہ اُسے ایسی جگہ ملے' جہاں بیٹیاں اپنی ماؤں سے محبت کرتی ہوں۔ اس کے بعد اُسے اپنے ارد گرد کے لوگوں کے اخلاص پر کوئی اعتماد نہ رہا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ لوگ (اس کے سوا) ایک دوسرے سے محبت بھی کر سکتے ہیں۔ تمام عزیز محض رواج کے طور پر ایک دوسرے کو چومتے تھے۔ حالانکہ دل ہی دل میں انہیں ایک دوسرے سے اختلاف تھا۔ اس نے دیکھا کہ اس دنیا میں لوگ انانیت کی زرہ بکتر پہن کر پھرتے ہیں۔ خود پرستی کی شراب انہیں مخمور رکھتی ہے۔ وہ دوسروں کی تعریف کے بھوکے ہیں۔ وہ دوسروں کی کم سنتے ہیں۔ اُن کے عزیزوں پر مصیبت آئے تو اُن پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ جب اُن کی اپنی خواہشات کا سوال آ جائے تو پھر کوئی لاکھ التجائیں کرے اُن کا دل نہیں پسیجتا۔ آدم کی یہ اولاد چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے بخار چہ میں بیٹھے بیٹھے اس کے خیالات کا سلسلہ جب یہاں تک پہنچ جاتا تو اس کے لب شرم سے خود بخود سمٹ جاتے۔ وہ جانتی تھی کہ وہ خود بھی گنہ گار رہے۔ اگرچہ بیٹی کے

لئے اس کی یہ بے پناہ محبت اپنے اندر ہر قسم کے پیار کو لیئے ہوئے تھی۔ پھر بھی اس میں ظلم کا شائبہ ضرور تھا۔ وہ اپنی بیٹی کو بیٹی سمجھ کر نہیں بلکہ اپنی تسکین کی خاطر محبت کرتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ محبت کی اس ذلیل بندش سے آزاد ہو جائے۔ لیکن مامتا کا جذبہ اتنا شدید تھا کہ وہ اس سے مخلصی نہ حاصل کر سکی۔ پھر اسی سینہ بجارچے میں خیالات کی ایک نئی کشمکش اس بوڑھی عورت پر لرزہ طاری کر دیتی۔ وہ ان خیالات کے نیچے دب جاتی۔ بھلا وہ اپنی بیٹی پر حکومت کر سکتی تھی؟ حالاں کہ اس کی بیٹی کو اچھا بھلا علم تھا کہ ان کے درمیان چار ہزار میل کا فاصلہ ہے۔ خاتون ماریا خیالات کے ان بھوتوں کا مقابلہ کرتی مگر ہر بار شکست کھاتی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کی بیٹی اس کی ہو جائے۔ وہ سننا چاہتی تھی کہ کوئی کہے: "ماں! تم ساری دنیا کی ماؤں سے اچھی ہو۔" اس کے کان منتظر تھے کہ کوئی ان کانوں میں مدھم آواز سے کہے: "ماں! مجھے معاف کر دو۔"

اسپین سے واپسی کے دو سال بعد چند معمولی واقعات رونما ہوئے مگر یہ واقعات خاتون ماریا کی زندگی پر کافی روشنی ڈالتے ہیں۔ ان واقعات کا ذکر کہیں کہیں ماریا کے خطوط میں آتا ہے۔ چنانچہ بیٹی کے نام ایک خط میں وہ لکھتی ہے:۔

"کیا اسپین میں کوئی ڈاکٹر نہیں؟ فلانڈر کے وہ معزز لوگ کہاں گئے جو کبھی تمہاری مدد کیا کرتے تھے؟ میری زندگی کے خزانے! یہ کیسے ممکن ہے کہ

تم زکام سے بیمار رہو۔ یہ سزا نہیں تو اور کیا ہے؟ میرے ننھے وسنتے! تم میری بچی کو سمجھاؤ۔ خدا کے لئے اُسے سمجھاؤ۔ اب تمہاری حالت پہلے سے اچھی ہے میں التجا کرتی ہوں کہ تم اس کا خیال رکھا کرو۔ جونہی سردیوں کے دن آئیں تم لوگ سرشام ہی گھر چلے جایا کرو اور بستروں میں دراز ہو جاؤ۔ میں بیوہ ہوں اور تمہارے لئے کچھ نہیں کرسکتی۔ میری پیاری بچی! کبھی کسی کی ماں بھی لیا کرو، ہمیشہ اپنی نہ کیا کرو۔ خدا تمہارا محافظ ہو۔ میں درختوں کی گوند بھجوا رہی ہوں۔ یہ گوند خانقاہ تو ماس کی راہبائیں گھر گھر بیچتی پھرتی تھیں۔ یہ تمہارے کام آسکتی ہے یا نہیں، یہ میں نہیں جانتی۔ بہرحال اس کا استعمال نقصان نہیں دے گا۔ میں نے سنا ہے کہ خانقاہ میں راہبائیں خود اس کا استعمال کرتی ہیں۔ تم بھی دیکھو شاید کسی کام آجائے۔" یقین رکھو، میں حضور ملک معظم کے لئے سونے کی زنجیر بھیج رہی ہوں" (اس کی بیٹی نے اُسے لکھا تھا۔ کہ ماں! تمہاری بھیجی ہوئی زنجیر اچھی حالت میں مل گئی ہے میں نے ایک بچے کی رسم بپتسمہ کے موقع پر اُسے پہنا۔ حضور ملک معظم نے ازراہ کرم اُس کو سراہا اور جب میں نے انہیں بتایا کہ یہ زنجیر تم نے بھیجی ہے تو انہوں نے تمہارے ذوق کی داد دی۔ اس لئے ایک ایسی ہی زنجیر ملک معظم کے لئے ضرور بھیج دو۔ دیکھنا بھول نہ جانا۔ ایسی زنجیر محلات کے داروغہ کے ذریعے سے ملک معظم کی خدمت میں فوراً بھیج دو)" انہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اسے حاصل کرنے کے لئے مجھے ایک تصویر خانے میں جانا پڑا۔ تمہیں سان مارٹن

گرجا کا وہ حصہ یاد ہوگا جہاں سامان وغیرہ رکھا رہتا ہے۔ وہاں وائسرائے اُس کی بیوی اور بچے کی تصویر آویزاں ہے۔ یہ وہ وائسرائے ہے جس نے خانقاہ کی بنیاد رکھی تھی۔ بیوی کے گلے میں سونے کی ایک زنجیر ہے۔ چنانچہ میں نے سوچا ویسی زنجیر موزوں رہے گی۔ ایک رات میں اس حصہ میں چوری چھپے پہنچی۔ ایک بارہ برس کی چھوکری کی طرح میز پر چڑھ گئی۔ میں تصویر کی کنوس دیکھ رہی تھی کہ محافظ خود میری مدد کو آ گیا۔ اس نے مجھے اندر بلا لیا۔ میں نے اُسے بتایا کہ ملک اسپین کی سب سے خوبصورت لڑکی دنیا کے سب سے بڑے بادشاہ کی خدمت میں نفیس ترین سونے کی زنجیر پیش کرنا چاہتی ہے ———

ہم دونوں کھڑے باتیں کرتے رہے۔ نگارخانہ کی ہوا کو اگر بھوری اور چاندی ایسی کہا جائے تو غیر موزوں نہ ہوگا۔ پھر میں اس سے زیادہ روشنی کے بارے میں سوچنے لگی۔ میں محل کی طرف دیکھ رہی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ شام وائسرائے کے محل میں گزاروں۔ جانے وائسرائے مجھے اس کی اجازت دیں گے؟

"حضور وائسرائے کو پھر گنٹھیا کا دورہ پڑا۔ میں نے پھر اس لئے کہا ہے کہ دربار کے خوشامدی لوگ اُسے کئی بار یقین دلاتے ہیں کہ اب وہ اس مرض سے آزاد ہو گیا ہے۔ آج سان مارک ——— کا دن تھا۔ ہز ایکسیلنسی یونیورسٹی کی جانب روانہ ہونے والے تھے جہاں آج بائیس نئے ڈاکٹروں کا اضافہ ہونے والا تھا۔ ابھی مشکل سے انہیں دیوان سے اٹھا کر گاڑی پر لے جایا گیا کہ انہوں

نے زور زور سے چیخنا شروع کر دیا اور آگے جانے سے انکار کر دیا۔ مجبوراً انہیں واپس لایا گیا۔ انھوں نے بستر پہ دراز ہو کر ایک سگار سلگایا اور رقاصہ کو بلوا بھیجا۔ ادھر ہم یونیورسٹی میں بیٹھے لاطینی زبان میں علمی خطبات سن رہے تھے اُدھر اُسے ہسپانوی زبان میں ہمارے متعلق باتیں کہی جا رہی تھیں۔ اس کے کان بھرے جا رہے تھے۔ باتیں سنانے والے لب ملک میں اپنی سرخی اور تلخی کی وجہ سے مشہور ہیں" (خاتون ماریا نے پھر یہ فقرات لکھ دیئے۔ حالاں کہ اس کی بیٹی نے آخری خط میں لکھا تھا کہ "میں نے کتنی بار تمہیں لکھا ہے کہ خطوں میں احتیاط سے چیزوں کا ذکر کیا کرو۔ مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے خطوط راستے میں کھوے جاتے ہیں۔ تم جو حالات لکھتی ہو وہ مضحکہ خیز تو نہیں۔ لیکن جو الفاظ تم استعمال کرتی ہو وہ غیر محتاط ہوتے ہیں۔ وسنتے نے اپنے خط میں تمہارے خیالات کی داد بھی دی ہے۔ مگر ڈر ہے اُن کی وجہ سے بعض لوگ کوئی آفت نہ کھڑی کر دیں۔ میں حیران ہوں کہ تمہاری عاقبت نااندیشی نے ابھی تک تمہیں مجبور کیوں نہیں کیا کہ تم اپنی زمینوں میں چلی جاؤ اور زندگی کے دن وہیں علیحدگی میں گزارو")

"کھیلوں کے وقت کافی دھکم دھکا تھا۔ دو عورتیں بالکونی سے نیچے گر پڑیں۔ مگر خدا نے اپنا فضل کیا اور وہ خاتون مارسیڈ پر آن پڑیں۔ بے چاری تینوں مجروح ہو گئیں۔ جب یہ حادثہ ہوا تو صدر تقریر کر رہا تھا۔ اُس کی نظر

کمزور تھی۔ اس لئے اُسے معلوم نہ ہوسکا کہ حاضرین میں شور و غوغا کیوں برپا ہے اور یہ کہ تین عورتیں زخمی ہوئی ہیں۔ وہ یہ شور سن کر ادب سے جھک گیا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ لوگ اس کی تقریر سن کر اُسے داد دے رہے ہیں اور وہ داد کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جھک رہا تھا۔"

"رقاصہ اور داد کا ذکر یوں ہی آگیا۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ میں اور پی پتیا آج شام کیڈٹا جارہی ہیں۔ لوگ ابھی تک اس رقاصہ کی پرستش کرتے ہیں۔ اس کی عمر کو بھی وہ بھول جاتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ رقاصہ ہر روز صبح اُٹھ کر اپنے رخساروں پر برف اور آگ ملتی ہے (یہاں خط کا ترجمہ اچھی طرح نہیں ہوسکا کیونکہ ہسپانوی زبان کی صحیح ترجمانی مشکل ہے۔ بہرحال ماریا کا یہ کہنا کہ رقاصہ زیادہ عمر کی ہے۔ درست معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس وقت رقاصہ کی عمر صرف اٹھائیس برس کی تھی۔ اس سے اس کے چہرے کی خوب صورتی بھلا کیسے مرث سکتی تھی۔ اس کے نرم و نازک رخسار اور ان کا رنگ بھلا شوخ کیوں نہ ہوتا۔ غازہ یا سرخی جو اُسے رقص کرتے وقت لگانا پڑتا تھا' وہ استعمال کرتی تھی۔ ورنہ اس کے سوا رقاصہ کو میلا چہرے پر دن میں دو بار کسان عورتوں کی طرح ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارا کرتی)

"وہ عجیب سا انسان جسے سب چچا پیپو کہتے ہیں' ہر وقت اس کے پاس رہتا ہے۔ ڈان روبیو کہتا ہے کہ وہ آج تک یہ معلوم نہیں کرسکا۔ کہ آیا

یہ چچا پُھپو رقاصہ کا باپ ہے، عاشق ہے یا اس کا بیٹا۔ رقاصہ کا ناچ خوب تھا۔ نہیں یہ مقامی باتیں شاید بُری لگیں اور تم مجھے ڈانٹ دو مگر اس ایسی رقاصہ تمہارے سارے اسپین میں کہاں ملے گی"

تھیٹر میں وہ رقص دیکھنے گئی۔ آئندہ کے سارے واقعات اسی سے متعلق ہیں۔ وہ رقاصہ کا ناچ دیکھنے کیڈاٹی گئی۔ جہاں وہ ایک کھیل میں اداکاری کر رہی تھی۔ یہاں سے اُسے بیٹی کو ایک اور خط لکھنے کا مواد مل گیا۔ وہ اپنے ساتھ ایک نوجوان لڑکی پی پیتیا کو بھی لیتی گئی۔ اس لڑکی کے بارے میں آگے چل کر کافی روشنی پڑتی ہے۔ خاتون ماریا نے اس بچی کو سان ماریا روزا کے یتیم خانہ سے اپنے پاس بلا لیا تھا۔ خاتون ماریا اپنے بکس میں بیٹھی اسٹیج کی آب و تاب میں محو تھی۔ قصے کے دوران میں اس رقاصہ کا شاعر تھا کہ وہ پردہ کے سامنے آ کھڑی ہوتی اور چند مروجہ گیت سنا دیا کرتی۔ اس کھیل کی اداکارہ نے جونہی خاتون ماریا کو دیکھا تو اس کی آمد پر اشعار کہنے لگی جس میں ماریا کو حریص اور شرابی کہا گیا۔ دونوں ماں بیٹیوں کے جھگڑے کا بھی ذکر کیا گیا۔ یہاں تک کہا گیا کہ بیٹی ماں سے بھاگ گئی ہے۔ سارا ہال اس بوڑھی خاتون کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر سرگوشیاں ہوئیں اور بالآخر حاضرین قہقہے لگانے لگے۔ مگر خاتون ماریا پہلے دو مزاحیہ مناظر میں اس قدر کھوئی تھی کہ اُسے رقاصہ کے گانے کا علم بھی نہ ہوا۔ وہ اس وقت اسپین کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ لوگوں کی داد نے رقاصہ کو اور بھی شہ دی

وہ اور زیادہ نفرت کا اظہار کرنے لگی۔ آخر کار پی پیتا نے خاتون ماریا کی آستین کھینچی اور اُسے کان میں کہا آؤ یہاں سے اُٹھ چلیں۔ جونہی وہ جانے کے لئے اٹھی سارا ہال قہقہوں کے شور سے بھر گیا۔ رقاصہ بے خود ہو کر وہیں ناچنے لگی کیونکہ اس نے ہال کی پشت پر مینیجر کو دیکھا۔ وہ جان گئی کہ اب اس کی تنخواہ میں اضافہ ہوگا۔ یہ سب کچھ ہوا مگر خاتون ماریا اس ہنگامے سے بے خبر تھی۔ بلکہ وہ تو خوش تھی۔ وہاں بیٹھے بیٹھے اس نے چند پُر لطف جملے سوچے تھے۔ وہ انہیں بیٹی کو لکھے گی۔ اُسے یقین تھا کہ بیٹی یہ جملے پڑھتے ہی پھڑک اُٹھے گی اور بے اختیار کہے گی: "میری ماں سچ مچ بڑی اچھی ہے۔"

بات آخر کار وائسرائے کے کانوں تک پہنچی کہ کس طرح اس کے ایک درباری کو سرِ عام تھیٹر میں ذلیل کیا گیا اس کا تمسخر اڑایا گیا۔ اس نے فوراً رقاصہ کو محل میں حاضر ہونے کا حکم صادر کیا۔ جب وہ حاضر ہوئی تو اُسے کہا گیا کہ وہ جا کر خاتون ماریا سے معافی مانگے اور ننگے پاؤں سیاہ لباس میں خاتون ماریا کے مکان تک جائے۔ کومیلا نے اس حکم کے خلاف کچھ کہنا چاہا مگر شنوائی نہ ہوئی۔ ہاں اتنی اجازت مل گئی کہ وہ جوتا پہن کر جا سکتی تھی۔

اس حکم کے صادر کرنے میں وائسرائے کے پیشِ نظر تین باتیں تھیں اوّل یہ کہ رقاصہ نے دربار کی عنایات کا ناجائز فائدہ اٹھایا تھا۔ وائسرائے انڈریس اپنے درباریوں کا خاص خیال رکھتا تھا۔ ان کی ذرہ ذرہ سی بات کو

دیکھتا۔ اس لئے ماریا کی توہین کو اپنی ذاتی توہین جانا۔ دوسری بات یہ تھی کہ خاتون ماریا کا داماد اسپین کے شاہی دربار میں روز بروز ممتاز ہوتا جا رہا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر اس واقعہ کا اُسے علم ہو گیا۔ تو وہ اسے نقصان نہ پہنچائے اور ممکن تھا کہ وہ خود وائسرائے بن کر آجائے۔ پھر اس کا کہاں ٹھکانہ ہو گا۔ اس لئے وہ کونٹ وسنتے کو کسی حالت میں بھی ناراض کرنا نہ چاہتا تھا۔ اگرچہ اس کی بوڑھی ساس حواس باختہ تھی۔ تیسری وجہ اس سزا کی یہ تھی کہ رقاصہ کو ذلیل کرنے میں خود وائسرائے مسرت پا رہا تھا۔ اُسے شک تھا کہ وہ اُسے دھوکہ دے رہی تھی اور کسی اور سے معاشقہ کر رہی تھی۔ گنٹھیا کی تکلیف اور دربار کے خوشامدی ماحول کے باعث وہ معلوم نہ کر سکا کہ وہ کس کی محبت میں گرفتار تھی۔ بہرحال یہ تو صاف عیاں تھا کہ وہ وائسرائے کو بالکل بھولتی جا رہی تھی۔

خاتون ماریا نے چونکہ وہ گانا سرے سے سنا ہی نہ تھا اس لئے رقاصہ کی آمد سے وہ بالکل بے خبر تھی۔ بیٹی کے چلے جانے کے بعد خاتون ماریا نے اپنے آپ کو تسلی دینے کا نیا طریقہ سوچ لیا تھا۔۔ وہ شراب پینے لگی تھی پیرو میں ہر کوئی دیسی شراب پیتا۔ جسے وہاں "چی چا" کہتے۔ اگر کوئی شخص کسی تہوار کے موقع پر زیادہ پی لیتا اور بدمست ہو جاتا تو اس بات کا کوئی بُرا نہ مناتا۔ خاتون ماریا نے جان لیا کہ اس کی شب بیداری کا باعث اکیلے میں اپنے آپ سے باتیں کرنا ہے۔ چنانچہ ایک دن اُس

نے ایک نازک اور نفیس جام "چی چا" سے بھر کر حلق میں انڈیل لیا۔ خود فراموشی کے سرور سے اُسے وہ لذت آئی کہ وہ اور پی گئی۔ مگر وہ اتنے ہوش میں تھی کہ پی پیتا کو معلوم نہ ہونے دیا۔ طبیعت کی ناسازی کا بہانہ کر کے وہ لیٹنے چلی گئی۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ سب بہانے ختم ہو گئے۔ اسپین کو ڈاک لے جانے والا جہاز مہینے میں ایک بار جاتا تھا۔ اس کے ذریعے سے وہ بیٹی کو خط بھیجا کرتی۔ جس ہفتے جہاز جانے والا ہوتا۔ اُن دنوں وہ باقاعدہ ہو جاتی اور شہر میں لگاتار اِدھر اُدھر گھومتی تاکہ بیٹی کو خط لکھنے کے لئے مواد اکٹھا کر سکے۔ پھر وہ آخری دنوں میں خط لکھنے بیٹھ جاتی جب خط مکمل ہو جاتا تو اُسے بند کر کے پی پیتا کو دیتی کہ وہ ایجنٹ کے حوالے کر آئے۔ دوسرے دن سورج کے طلوع ہوتے ہی وہ ایک کمرے میں بند ہو جاتی، سامنے صراحی اور پیالہ ہوتا اور پھر اتنی پیتی کہ اس بے خودی کے عالم میں ہفتے گزر جاتے پھر وہ اس مسرت و سرور کی دنیا سے بیدار ہوتی اور اگلے خط کی تیاری شروع کر دیتی۔

ٹھیٹر کے واقعہ کی دوسری رات اس نے بیٹی کو بارھواں خط لکھا۔ اور اس کے بعد وہ گلابی لے کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ دوسرے دن پی پیتا اِدھر اُدھر کمرے میں پھرتی اور بے تابی سے بستر پر لیٹی ہوئی بڑھیا کو تکتی رہی۔ دوپہر کے بعد پی پیتا اس کی سلائی کا کام وہیں لے آئی۔ خاتون ماریا لیٹی کھلی آنکھوں سے تتر بتر چھت کو تکا کر رہی تھی اور اپنے آپ سے باتیں کئے جا رہی تھی جھٹ پٹے

سے کے قریب کسی نے دروازے پر دستک دی۔ پی پیتا نے جاکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ رقاصہ اس کی مالکن سے ملنے آئی ہے۔ پی پیتا کو تھیٹر کا واقعہ یاد تھا اس لئے اس نے غصے میں کہلا بھیجا کہ خاتون اُسے نہیں مل سکتی۔ خادم یہ پیغام لے کر رقاصہ کے پاس گیا لیکن فوراً گھبرایا ہوا واپس آیا اور خبر لایا کہ رقاصہ کے پاس وائسرائے کا ایک خط تھا۔ جو وہ خود خاتون کی خدمت میں لے کر حاضر ہوگی۔ پی پیتا دبے پاؤں بستر کے قریب گئی اور خاتون سے باتیں کرنے لگی۔ بے نور آنکھیں لڑکی کے چہرے کو تکنے لگیں۔ پی پیتا نے دھیرے دھیرے اُسے ہلایا۔ بڑی مشکل سے خاتون ماریا اپنے آپ کو ہوش میں لائی اور لڑکی کی بات سمجھ سکی۔ اُسے ابھی تک پوری طرح ہوش نہ آیا تھا لیکن آخر کار ایک جرنیل کی طرح جو بارش اور اندھیری رات میں اپنی منتشر فوج کو جمع کرنے کی کوشش کر رہا ہو اس نے بھی پریشان خیالوں کو جمع کیا۔ اپنے تئیں سنبھالا۔ بڑی مشکل سے وہ اپنا ہاتھ اپنے ماتھے تک لے گئی۔ پھر برف مانگی۔ جب برف لائی گئی تو اس نے مٹھی بھر برف سے کراپی کنپٹیوں اور رخساروں پر ملی۔ پھر اس نے اُٹھنے کی کوشش کی اور کافی دیر تک چارپائی کے سہارے جھک کر اپنے جوتوں کی طرف دیکھتی رہی۔ آخر کار اس نے عزم کر کے اپنا سر اٹھایا۔ اپنا سموری لبادہ اور نقاب مانگا۔ انہیں پہن کر وہ اپنے ملاقات کے کمرے میں لڑکھڑاتی ہوئی چلی۔ یہ کمرہ سب کمروں میں سے خوبصورت تھا۔ جہاں رقاصہ اس کی منتظر تھی۔

کومیلا کی مرضی تو تھی کہ وہ بالکل رسمی طور پر ملاقات کرے اور اگر موقع ملے تو پھر گستاخ ہو جائے۔ لیکن جونہی اُس نے بوڑھی خاتون کو دیکھا تو پہلی بار اُسے اس کی عظمت کا احساس ہوا۔ بزاز کی یہ لڑکی واقعی اب خاتون معلوم ہو رہی تھی۔ خمار نے اس کی شان کو اور بھی دوبالا کر دیا۔ نیم وا آنکھیں زیادہ پُر رعب دکھائی دیں اور کومیلا نے بڑی ہچکچاہٹ سے سلسلہ کلام شروع کیا۔

"محترمہ کل رات تھیٹر میں تشریف لا کر آپ نے مجھے نوازا۔ مجھے ڈر ہے کہ میرے گانے سے آپ کے دل میں غلط فہمی نہ پیدا ہو گئی ہو۔"

"غلط فہمی؟ کیسی غلط فہمی؟" خاتون نے پُوچھا

"مجھے ڈر ہے کہ شاید محترمہ کو میرے الفاظ سے غلط فہمی ہوئی ہو۔ میرا مقصد آپ کی بے عزتی کرنا نہ تھا۔"

"میری بے عزتی؟"

"کیا حضور اپنی خادمہ سے ناراض تو نہیں؟ آپ جانتی ہیں کہ ایک بے چاری رقاصہ کو بعض اوقات اپنی مرضی کے خلاف جانا پڑتا ہے ...... یہ ہوتا ہے .... کہ اُسے ...."

"میں کیوں ناراض ہونے لگی؟ مجھے تو اتنا یاد ہے کہ اُس رات تم نے خوب جوہر دکھائے۔ تم بہت بڑی فن کار ہو۔ تمہیں خوش رہنا چاہئے خوش .... پی پپیا! میرا رومال ...."

خاتون جلدی جلدی یہ الفاظ بے دھیانی میں کہہ گئی لیکن رقاصہ شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ خاتون کے الفاظ اس کے دل میں نشتر چبھو رہے تھے۔ ندامت سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ بالآخر بڑی مشکل سے اس نے کہا۔

"حضور! میرا مطلب ہے' وہ گانا جو میں نے دو مناظر کے درمیان گایا تھا۔ شاید... ..."

"ہاں ہاں اب یاد آیا۔ میں پہلے چلی آئی تھی۔ کیوں پی پیتا ہم جلد ہی اُٹھ آئے تھے نا؟ تم۔ مجھے معاف کر دینا میں کھیل کے درمیان سے ہی آ گئی تھی۔ تمہارا سارا کام بھی نہ دیکھ سکی۔ ہم کیوں چلے آئے تھے۔ یاد نہیں رہا مجھے پی پیتا ...... ؟ شاید میری طبیعت کچھ .... ؟"

بھلا یہ کیسے ممکن ہو سکتا تھا کہ کوئی ہال میں بیٹھا اس کے گانے کو نہ سُن سکے کوہیلا نے سمجھا' شاید خاتون اپنی غیر معمولی عالی ظرفی کا ثبوت دینے کے لئے اداکاری کر رہی ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ "محترمہ! تو آپ نے میرے بچپنے کو معاف کر دیا۔ میں نہ جانتی تھی۔ میں نہ جانتی تھی کہ آپ اتنی اچھی ہیں' مجھے اجازت دیجئے کہ حضور کے مبارک ہاتھوں کو بوسہ دوں۔"

خاتون مارے حیران ہو گئی۔ اس نے ہاتھ بڑھا دیا۔ آج تک کسی نے اُسے یوں مخاطب نہ کیا تھا۔ اس کے پڑوسی' لین دین کرنے والے اس کے خادم' یہاں تک کہ پی پیتا بھی' سب کے سب اس سے دبتے تھے۔ اس کی بیٹی نے

بھی کبھی اُسے یوں مخاطب نہ کیا تھا۔ ان الفاظ نے اس کی حالت بدل دی۔ اس پر ایک قسم کی رقت طاری ہو گئی۔

"ناراض! ناراض اور تم سے' میری پیاری بچی' تم کتنی خوب صورت ہو' خدا نے تمہیں کیا کیا جوہر عطا کئے ہیں..... میں........ میں' ایک بے وقوف بڈھیا' جسے کوئی محبت تک نہیں کرتا۔ تم سے کیوں کر ناراض ہو سکتی ہوں؟ میری بیٹی' میں نے یوں محسوس کیا' جیسے بادلوں میں سے فرشتوں کی آواز آرہی ہو۔ تمہاری آواز نے ڈرامہ کے الفاظ میں جان ڈال دی اور جب تم گارہی تھیں۔ میری روح مسرور ہو گئی۔ پہلی رات تم نے ہاتھوں کے اشارں سے کمال کر دکھایا۔ مجھے کنواری مریم یاد آرہی تھی جب وہ جبرائیل سے مخاطب ہوتی "یہ کیسے ممکن ہے کہ میں بچے کی ماں بن سکوں"۔ ہاں تم مجھ پر ناراض نہ ہو جاؤ گی اگر میں بھی تمہیں ایک اشارہ بتاؤں۔ اسے یاد رکھنا اور کسی دن اداکاری کرنے وقت استعمال کرنا۔ وہ سین خوب رہے گا جہاں تم اپنے جان کو معاف کر دیتی ہو۔ بات یہ ہے کہ یہ اشارہ ایک دفعہ میری بیٹی نے کیا تھا —— میری بیٹی' تم اُسے جانتی ہونا'...... وہ کتنی خوب صورت ہے سب اُسے خوب صورت کہتے ہیں......"

"جی ہاں' حضور بھی میرے تھیٹر میں تشریف لا کر مجھے سرفراز کرتی تھیں۔ میں نے محترمہ کو کئی بار دیکھا تھا۔"

"میری بچی! تم کب تک یوں گھٹنوں کے بل کھڑی رہوگی۔ پی پیتا! خادم سے کہو کہ وہ اس خاتون کے لئے فوراً مٹھائی لائے ——— ایک دن ہم ماں بیٹی ناراض ہوگئیں ——— کیوں؟ یہ مجھے یاد نہیں رہا۔ یہ کوئی نرالی بات تھوڑی ہے ہم مائیں اکثر کبھی کبھی، .... ذرا نزدیک سرک آؤ ——— لوگ کہتے ہیں کہ میری بیٹی مجھ سے رکھائی برتتی رہی ہے۔ انہیں کہنے دو، تم کبھی اُن کی باتوں کا یقین نہ کرنا۔ تم ایک ناموَر عورت ہو۔ تمہاری فطرت نیک ہے۔ تمہاری نگاہ عوام سے زیادہ گہری ہے۔ تم سے باتیں کر کے مجھے کیسی مسرت ہو رہی ہے تمہارے بال کتنے خوب صورت ہیں۔ خوب صورت بال! میں جانتی ہوں میری بیٹی کی طبیعت میں گرم جوشی یا جذبات نہیں ہیں۔ مگر میری بچی یقین مانو۔ وہ بڑی ذہین اور دلفریب ہے۔ ہمارے درمیان اگر کبھی غلط فہمی ہوتی بھی تو اس میں میرا ہی قصور تھا اور جانتی ہو کہ وہ مجھے فوراً معاف کر دیا کرتی ہے۔ ایک دن ایسا واقعہ پیش آیا۔ ہم دونو نے ایک دوسرے کو تلخ باتیں کہیں اور دونو اپنے اپنے کمروں میں چلی گئیں۔ تھوڑی دیر بعد ہم دونو ایک دوسرے کو معاف کرنے کے لئے باہر نکلیں۔ ہمارے درمیان صرف ایک دروازہ تھا جسے ہم دونو مخالف سمتوں میں دھکیلنے لگیں۔ مگر آخر کار اُس نے ...... میرا چہرہ ......

اپنے سفید ہاتھوں میں لے لیا ...... اور یوں ......"

خاتون آگے جھکی اور گرتے گرتے بچی۔ اس کے رخسار خوشی اور محبت

کے آنسوؤں سے تر تھے ۔ اس نے ہاتھ سے ایک اشارہ کیا ۔ یہ اشارہ کتنا حسین تھا۔ اس کے پس منظر میں ایک چھوٹا سا واقعہ خواب کی طرح اس کے ذہن میں کروٹیں لینے لگا۔

اس نے پھر سلسلۂ کلام شروع کیا "تمہاری موجودگی سے میں بہت خوش ہوں ۔تم نے خود میرے منہ سے ساری بات سُن لی ہے ۔ وہ کبھی مجھ پر نامہربان نہیں ہوئی۔ لوگ خواہ نخواہ اُسے بدنام کرتے ہیں ۔قصور سارا میرا ہی تھا۔ بھلا میں اتنی خوب صورت لڑکی کی ماں ہو سکتی ہوں ۔ میں خود سڑانڈ ہوں سناڈ ہوں ۔ وہ اور تم دونوں نامور خواتین ہو ۔ مجھے کہنے دو ۔تم ایک نادر عورت ہو اور میں ایک .... زود رنج' بے وقوف .... اور کم فہم' مجھے اپنے پانو چومنے دو ۔ میں کتنی ستاؤ ہوں ۔ستاؤ ـــــ"

اب بوڑھی خاتون کرسی سے واقعی گر پڑی ۔ پی پیتا نے مشکل سے اُسے سنبھالا اور اس کے کمرے میں لے جاکر بستر پر لٹا دیا ۔ رقاصہ پر سراسیمگی کا عالم طاری تھا وہ اسی حال میں لوٹی ۔گھر پہنچ کر آئینہ کے سامنے کافی دیر تک بیٹھی اپنی آنکھوں میں دیکھتی رہی ۔ اس کی دونو ہتھیلیاں رخساروں کو دبائے تھیں ۔

خاتون کی زندگی کے نازک لمحات دیکھنے والی صرف ایک ہستی تھی اور وہ اس کی ننھی مصاحب پی پیتا تھی ۔ پی پیتا یتیم بچی تھی ۔ لی ما کی عجیب و

غریب ذہین عورت اور یتیم خانہ کی منتظمہ نے اس بچی کو خود پالا تھا۔ ملک پیرو کی
یہ دونو عظیم الشان عورتیں صرف ایک بار ایک دوسرے سے ملی تھیں۔ یہ وہ
دن تھا جب خاتون یتیم خانہ گئی اور منتظمہ سے درخواست کی کہ "مجھے مصاحبت
کے لئے ایک ہوشیار سی بچی چاہیئے۔ جسے میں پال پوس کر بڑا بھی کروں گی"۔
منتظمہ نے گھور کر اس نامور خاتون کو دیکھا۔ دنیا کے دانا لوگ بھی مکمل طور پر دانا
نہیں ہو سکتے۔ منتظمہ کی تیز نگاہیں خاتون کے دل کے اندر تک چلی گئیں وہ
بڑھیا حماقتوں کے پردے میں بھی اُسے دیکھ سکتی تھی۔ مگر بڑھیا نے خاتون پر سوالات
کی بوچھاڑ کر دی۔ پھر جواب کا انتظار کئے بغیر گہری سوچ میں پڑ گئی۔ اس کے
سامنے دو مقصد تھے۔ ایک تو وہ پرہتا کو محلات کی زندگی سے روشناس
کرانا چاہتی تھی۔ دوسرے وہ اس بوڑھی عورت کو اپنے مفاد کے مطابق موڑنا
چاہتی تھی اس کا چہرہ مغموم ہو گیا اور مزاج میں برہمی آ گئی۔ وہ خوب جانتی
تھی کہ وہ پیرو کی سب سے دولت مند مگر عقل کی اندھی عورت کو گھور رہی ہے
یہ منتظمہ رضا راہبہ ان لوگوں میں سے تھی۔ جو اپنی جان کو اس لئے
ہلکان کئے دیتے ہیں کہ انہیں ایک خیال سے محبت ہو جاتی ہے۔ یہ خیال اپنے
اصلی وقت سے صدیوں پہلے آ پہنچا ہے۔ حالانکہ تمدن کی تاریخ میں اس کے
رونما ہونے کا وقت سیکڑوں برس بعد آتا ہے۔ وہ زمانے کی خود رائی کے خلاف
جہاد کر رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ عورت کا درجہ بلند ہو۔ نصف رات گئے تک

وہ یتیم خانہ کے حساب کتاب میں مصروف رہتی۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ سوچنے لگتی۔ اس کی یہ سوچ اس زمانے کے لحاظ سے ایک پاگل پن تھا۔ وہ سوچتی کہ عورتوں کو منظم کیا جائے تاکہ وہ اپنی نگہداشت کر سکیں۔ اس کے سامنے وہ عورتیں آجاتیں جنہیں اس نے بے یار و مددگار سفر کرتے دیکھا تھا۔ بیچاری خادم عورتیں جن میں جوان بھی تھیں اور بوڑھی بھی، کانوں میں کام کرنے والی بدحال عورتیں، درزیوں کے ہاں سلائی کرنے والی بے نوا عورتیں اور پھر وہ لاوارث بچیاں جو اُسے اکثر برساتی راتوں میں ملا کرتی تھیں۔ رات بھر وہ انہیں خیالات میں کھو جاتی۔ لیکن صبح ہوتے ہی اُسے حقیقت سے دوچار ہونا پڑتا۔ اُسے یوں محسوس ہوتا جیسے ملک پیرو کی ہر عورت، یہاں تک کہ اس کی خانقاہ کی راہبہ بھی زندگی کے بارے میں صرف دو نظریے رکھتی ہے۔ اول یہ کہ تمام دکھ درد اور تکلیفیں اس لئے آتی ہیں کہ ہم میں کسی مرد کو اپنانے کی کشش نہیں ہوتی۔ اور دوسرے یہ کہ مرد کے پیار کے سامنے دنیا بھر کے دکھ ہیچ ہیں۔ اس عورت نے اپنے ملک کے سوا دوسرا کوئی ملک نہیں دیکھا تھا۔ اس کے سامنے صرف لیما کے گرد و نواح تھے۔ اس نے جان لیا تھا کہ یہاں جتنی بھی خرابی ہے۔ وہ سب انسانوں کی ہی خرابی ہے۔ جب ہم اس زمانے پر نگاہ ڈالتے ہیں۔ تو ہمیں اس کی امید محض ایک حماقت نظر آتی ہے۔ اس زمانے کے حالات ایسے تھے کہ اگر اس ایسی بیس عورتیں بھی مل جاتیں تو بھی کچھ نہ بن

سکتا لیکن اس کے باوجود وہ نہایت مستعدی سے اپنے کام میں لگی رہی۔ اُس کی مثال اس روایتی ابابیل کی سی تھی جو ہر ہزار برس کے بعد گندم کا ایک دانہ اٹھا لاتی۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح سے اتنا انبار لگا دے گی کہ چاند تک پہنچ سکے گی۔ ایسے لوگ ہر صدی میں پیدا ہوتے ہیں۔ وہ گندم کے دانوں کا انبار لگا کر چاند تک پہنچنے پر ضد کرتے ہیں اور جب گذرنے والے اس پر آوازے کستے ہیں تو انہیں اس سے لذت سی محسوس ہوتی ہے۔ ہم ایسے لوگوں کو دیکھ کر چلّا اُٹھتے ہیں "ذرا ان کا لباس تو دیکھو — کتنا عجیب لباس ہے"

اس کے صاف اور سرخ چہرے پر شفقت نمایاں تھی۔ اس شفقت میں تصوریت کا پہلو زیادہ تھا اور تصوریت پر رہبری کا جذبہ غالب تھا۔ اس کے سارے کام۔ شفاخانے، یتیم خانے، خانقاہیں امدادی سفر سب کے سب روپے پیسے سے چلتے تھے۔ محض نیکی کی خاطر کوئی امداد نہیں کرتا۔ اس لئے وہ مجبور تھی کہ اپنی شفقت کی قربانی دے، تصوریت کو چھوڑے اور راہبری کے جذبہ کو ختم کردے۔ گرچہ کہ افسران بالا سے اپنے کاموں کے لئے امداد حاصل کرنے کے لئے اُسے بہت جد و جہد کرنا پڑی۔ لی ما کا لاٹ پادری جس کے بارے میں ہم آگے چل کر بہت کچھ جان سکیں گے۔ اسے بہت نفرت کرتا تھا۔ بہت زیادہ نفرت، جب کبھی یہ اُس سے ملنے جاتی وہ ملاقات کے خاتمے کو یوں محسوس کرتا جیسے مرنے والا سنبھالا لیتا ہے۔

آخر کار بڑھاپے کا سانس اس کے رخساروں سے ٹکرانے لگا۔ یہ ایک تکلیف دہ انتباہ تھا۔ خوف کی ایک سرد رو اس کے سارے جسم میں دوڑ گئی۔ اُسے اپنا اتنا خیال نہ تھا۔ جتنا اپنے کام کا۔ سارے ملک میں کون تھا جو ان چیزوں کو ویسے ہی جانچتا جیسے وہ جانچ رہی تھی۔ ایک دن جونہی وہ صبح صبح اُٹھی۔ تو اس نے بڑی تیزی میں اپنے شفاخانوں، خانقاہوں اور یتیم خانوں کا معائنہ کیا۔ وہ اپنا جانشین ڈھونڈ رہی تھی۔ وہ ایک بے رونق چہرے سے دوسرے بے رونق چہرہ پر جاتی۔ اور پھر کہیں کہیں رُک جاتی۔ اس میں یقین سے زیادہ امید تھی۔ ایک صحن میں چند لڑکیاں بیٹھی سلائی کر رہی تھیں اس کی نگاہیں ایک بارہ برس کی بچی پر قدرا رُک گئیں۔ یہ لڑکی دوسری بچیوں کو کام کی ہدایات دے رہی تھی۔ اور ساتھ ساتھ ولی ماں کے ولی رونز کی زندگی کے واقعات بڑے جوش وخروش سے بیان کرتی جاتی۔ اُسے اپنی مراد مل گئی۔ یہ لڑکی پی پیتا تھی کسی کو بڑا بنانے کے لئے تعلیم کا انتظام مشکل ہوتا ہے۔ مگر خانقاہ ایسے ماحول میں جہاں حسد اور رقابت کا دھیان رکھا جاتا ہے۔ وہاں تو یہ کام اور بھی دشوار تھا۔ پی پیتا کے سپرد خانقاہ کے بہت سے ناخوشگوار کام کئے گئے۔ جنہیں وہ بڑی خوش اسلوبی سے کرنے لگی۔ اُسے انتظامی باتوں کا خاصہ علم ہونے لگا۔ وہ بڑی راہبہ کے ہمراہ سفر پر بھی جانے لگی۔ اگرچہ دوران سفر میں اس کے سپرد انڈے اور سبزیوں کی رکھوالی ہوتی۔ پھر بیٹھے بیٹھے بڑی راہبہ اس سے باتیں

کرنے لگتی۔ یہ باتیں محض مذہبی تجربات نہ تھے۔ بلکہ وہ اُسے بتاتی کہ عورتوں کی تنظیم کیسے کی جاسکتی ہے۔ کیسے بیماروں کے لئے وارڈوں کا انتظام ہونا چاہئے اور پھر ان کاموں کے لئے کس طرح روپیہ اکٹھا کرنا ہوگا۔ اس لڑکی کو ایک نامور ہستی بنانے کے سلسلہ میں ایک دن نیا قدم اٹھایا گیا۔ وہ خاتون ماریا کی مصاحب بن کر عجیب وغریب فرائض سرانجام دینے لگی۔ پہلے دو برس تو وہ کبھی کبھی خاتون ماریا کے ہاں دوپہر کے بعد آتی۔ لیکن پھر مستقل طور پر اسی کے محل میں ہوٹھ آئی۔ اب تک اُسے کسی نے خوشی کی تمنا کرنا سکھایا ہی نہ تھا۔ باقی رہیں تکلیفیں۔ اس کی موجودہ جگہ چودہ برس کی لڑکی کے لئے کوئی زیادہ تعجب خیز نہ تھی اب اُسے اس بات کا خدشہ نہ رہا تھا کہ بڑی راہبہ چوری چھپے اُسے جھانک رہی ہوگی۔

پہلے پہل پی پیتا کو جسمانی طور پر سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ گھر کے نوکر خاتون ماریا کی بیماری سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے تھے۔ انہوں نے گھر کے سونے کے کمرے اپنے عزیزوں کے لئے کھول رکھے تھے۔ جو چھپ چھپا کر رات کو وہاں آجاتے۔ پی پیتا نے جب اس بات کو روکنا چاہا۔ تو سب خادم اس کے خلاف ہوگئے۔ اُسے دکھ دیتے اور اس کا مذاق اڑاتے۔ اس کے ساتھ اُسے روحانی دکھ بھی ہوتا۔ وہ یوں کہ خاتون ماریا کے ساتھ شہر میں گھومنا پڑتا۔ پھر یوں ہوتا کہ چلتے چلتے بڑھیا اچانک کسی گرجے میں گھس جاتی۔ اُسے مذہب

پر یقین نہیں تھا۔ مذہب کی جگہ سحر نے لے لی۔ اندر جاتے ہوئے وہ پی پیتا کو
یوں مخاطب ہوتی۔ "میری بچی! تم ذرا دھوپ میں ٹھہرو۔ میں ابھی آئی"۔ خاتون
ماریا قربان گاہ کے سامنے کھڑی اپنے خیالات میں اتنی منہمک ہو جاتی کہ اُسے
اپنا بھی ہوش نہ رہتا اور پھر دوسرے دروازے سے باہر چلی جاتی۔ پی پیتا
چونکہ بڑی راہبہ کی کڑی نگرانی میں بڑھی تھی۔ اس لئے اس میں فرماں برداری
کا جذبہ خطرناک حد تک پہنچ گیا تھا۔ کئی گھنٹے گذر جاتے اور جب اُسے یقین
ہو جاتا کہ خاتون اندر نہیں ہے۔ تو بھی وہ گلی کی نکڑ پر کھڑی رہتی۔ یہاں تک کہ
چوک میں سائے آہستہ آہستہ بڑھنے لگتے۔ سر بازار انتظار کرنا کتنا [illegible] وہ ننھا
لڑکی کی خود شعوری اس انتظار کو اور بھی ناقابل برداشت کر دیتی۔ وہ اب تک
یتیم خانہ کی وردی پہنے تھی (حالانکہ خاتون ماریا کی [illegible] اس کا نیا
لباس بن جاتا) اُسے دیکھ کر مرد آپس میں سرگوشیاں کرتے۔ بیہودہ سرگوشیاں ناگ
طرح کے وہم بن کر اُسے پریشان کرتیں۔ اس کا دل بھی دکھ سہتا۔ کیونکہ کسی دن
خاتون ماریا کو ایکا ایکی اس کی موجودگی کا احساس ہو جاتا اور وہ اس سے پیار
اور ہنسی خوشی کی باتیں کرنے لگتی۔ گھنٹوں یہ باتیں ہوتی رہتیں۔ ان دنوں
میں خطوط کا ہی زیادہ ذکر ہوتا۔ اس کے دوسرے دن وہ پھر خود فراموشی کے عالم
میں چلی جاتی۔ اب اُسے کسی کی خبر نہ ہوتی اور نہ ہی وہ کسی کو پہچانتی۔ پی پیتا
کے دل میں خاتون کی باتوں سے جو محبت اور امید کا جذبہ بیدار ہونے لگتا تھا

اور جسے وہ وسعت دینا چاہتی تھی مجروح ہو جاتا ــــ وہ دبے پاؤں محل میں اِدھر اُدھر پھرتی رہتی ۔ خاموش، حیران اور اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں مستغرق وہ سارا وقت گذار دیتی ۔ کیونکہ اُسے اپنی "مذہبی ماں" کے ارشاد کا بہت پاس تھا

بعض ایسے حالات ظاہر ہوئے جن کا اثر خاتون اور اس کی مصاحب پر بہت ہوا ۔ خاتون ماریا کی بیٹی نے اُسے ایک خط لکھا ۔ "پیاری اماں! آج کل موسم بہت تھکا دینے والا ہے ۔ باغ اور روشوں پر بہار کا جوبن ہے ۔ جسے دیکھ دیکھ کر دل نہیں بھرتا ۔ پھولوں کی اگر خوشبو نہ ہو تو میں انہیں بہت پسند کروں بس دیکھتی ہی رہوں ۔ اس لئے مجھے معاف کرنا اماں! میں تمہیں طویل خط نہیں لکھ سکی ۔ ڈاک جانے سے قبل اگر وقت آ گیا ۔ تو وہ تمہیں میرے متعلق ذرا ذرا سا حال لکھ بھیجے گا ۔ تمہیں تو ان باتوں سے بہت مسرت ہوتی ہے ۔ میں اب کے کہیں باہر نہیں جا رہی ۔ کیونکہ اکتوبر میں میرے ہاں بچہ ہوگا ۔"

"بچہ ؟" خاتون نے خط پڑھتے پڑھتے دیوار کا سہارا لیا ۔ خاتون کلارا خوب جانتی تھی کہ اس خبر کا اس کی ماں پر کیا اثر ہوگا ۔ اس لئے اس نے اس اہم خبر کو بالکل عام پیرایہ میں لکھ دیا ۔ لیکن اس حیلے کا خاطر خواہ اثر نہ ہوا ۔ اس کے جواب میں ماں نے بیالیسواں مشہور خط لکھا ۔

اب خاتون بہت بے قرار تھی ۔ اس کی بیٹی خود ماں بننے والی تھی ۔ خاتون کلارا کے لئے بچے کی پیدائش محض ایک مصیبت تھی ۔ مگر خاتون نے

جذبات کا ایک نیا معیار معلوم کر لیا۔ وہ اب طب کی ایک کان بن گئی۔ اس نے سارا شہر چھان مارا۔ جتنے دانا حکیم اور طبیب تھے ان سے ملی۔ نئی دنیا کے کونے کونے میں اس کے خطوط پہنچے۔ تاکہ وہ اپنی بیٹی کو ہدایات بھیج سکے۔ یہی نہیں بلکہ وہ توہم پرستی کا بھی شکار ہو گئی۔ بچے کی حفاظت کے لئے اس نے کئی ٹونے ٹوٹکے کرائے۔ سارے گھر میں حکم دے دیا گیا کہ کوئی گانٹھ نہ لگائی جائے۔ نوکرانیوں کو بال باندھنے کی ممانعت کر دی۔ ور وہ خود یوں بستر پر پڑ گئی۔ گویا اس کے ہاں بچہ ہوا ہے۔ سیڑھیوں پر سرخ چاک سے پاؤں کے نشانات لگا دیئے گئے۔ ایک خادمہ بدقسمتی سے ان پر پاؤں رکھ کر اوپر نہ جا سکی۔ تو اسے فوراً گھر سے نکال دیا گیا۔ اس نے بہتیرا واویلا کیا چیخی چلائی۔ مگر کسی نے فریاد نہ سنی۔ دیہاتی لوگوں میں بلیدان کا طریق مروج تھا۔ ایسے وقتوں میں انہیں اس سے ڈھارس بندھتی۔ لوگ اس نظارہ کے اثر کے خود شاہد بنتے۔ انہوں نے کئی بلاؤں کو ٹلتے دیکھا۔ اس سلسلہ میں خاتون ماریا نے عیسائیت کے سارے نسخے استعمال کئے۔ وہ منہ اندھیرے اٹھتی اور گلیوں میں ٹھوکریں کھاتی صبح کی عام دعاؤں میں شامل ہونے لگی۔ وہ قربان گاہ کے سامنے کھڑے ہو کر لوہے کا کٹہرہ تھام لیتی اور گڑگڑا کر مناجات پڑھتی۔ وہ چاہتی تھی کہ قربان گاہ پر رکھا ہوا بت ایک بار سر ہلا دے۔ ذرا مسکرا ہی دے۔ اس کی بیٹی کا یہ مشکل وقت بخیریت گزر جائے۔ "کنواری ماں! اچھی ماں! میری بچی پر اپنا ترس کرنا

اس کا مشکل وقت ٹل جائے۔"

بعض اوقات دن بھر کی ان اضطراری دعاؤں اور جنونی حرکتوں کے بعد اس پر ایک انقلابی کیفیت چھا جاتی ——— فطرت بہری ہے۔ خدا بے پروا ہے۔ انسان کی ساری طاقت مل کر بھی فطرت کے قانون کو بدل نہیں سکتی۔ تب وہ کسی گلی کی نکڑ پر ٹھہر جاتی۔ یاس اُسے سرگراں بنا دیتی۔ وہ دیوار کا سہارا لے کر کھڑی ہو جاتی۔ اس وقت اس کے جی میں آتا کہ کاش وہ کسی ایسی دنیا میں چلی جائے جہاں کسی قسم کا نظام نہ ہو۔ لیکن پھر عظیم المرتبت "شاید" اس کی فطرت کی گہرائیوں سے اُبھرنے لگتا۔ اور وہ بھاگتی ہوئی گھر پہنچتی اور اپنی بیٹی کے پلنگ کے قریب موم بتی روشن کر دیتی۔

آخر وہ وقت آگیا جس کے لئے وہ منتظر تھی اور جس کے لئے وہ اتنے جتن کر رہی تھی۔ وہ ایک مشہور خانقاہ کی زیارت کو روانہ ہوئی۔ اُسے یقین تھا کہ اگر پرستش میں کوئی اثر ہے تو وہ اسی خانقاہ سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اس خانقاہ کی سرزمین ——— اس لئے بھی زیادہ مقدس تھی کہ اس نے تین دینوں کا عہد دیکھا تھا۔ پیرو کی قدیم تہذیب سے پہلے یہاں آ کر لوگ چٹان سے لپٹتے اور اپنے تئیں کوڑوں سے پیٹتے تھے تاکہ آسمانوں سے اپنی من مانی باتیں منوا سکیں۔ یہاں جانے کے لئے خاتون کو ایک کرسی میں بٹھایا گیا۔ یہ "سان لوئی رے پل" پر سے گذرے اور پہاڑیوں پر چڑھنے لگے۔ یہ راستہ اس شہر کو جاتا تھا جہاں

یہ خانقاہ تھی۔ یہاں کی عورتیں کمر کے گرد بڑے بڑے پٹکے باندھتی تھیں۔ شہر میں سکون تھا۔ یہاں کے لوگوں کے چہروں پر ہر وقت ہلکی سی مسکراہٹ رہتی اور وہ دھیرے دھیرے کام کرتے تھے۔ یہاں کی ہوا لطیف تھی۔ جگہ جگہ ٹھنڈے پانی کے چشمے تھے۔ اس شہر کو گھنٹیوں کا شہر بھی کہا جا سکتا ہے۔ گھنٹیوں کی آواز مدھم اور سریلی ہوتی اگر کوئی جھگڑا بھی ہوتا تو اس میں بھی تلخی نہ آنے پاتی۔ اگر کبھی کسی کو مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا۔ تو دریائے اینڈریز کی بے پناہ وسعت اور روانی اس کی ساری کلفتوں کو بہالے جاتی۔ موسم کی خوشگواری کے سامنے یاس بھلا کہاں ٹھہر سکتی تھی۔ جونہی خاتون نے دور سے اس شہر کی سفید دیواروں کو دیکھا جو سب سے بلند چوٹی کے دامن میں واقع تھا۔ اس کی انگلیاں تسبیح کے دانوں پر رک رک گئیں۔ دعا کے الفاظ اس کے لبوں پر نامکمل رہ گئے۔"

وہ سرائے میں رکی تک نہیں۔ پی ہیتا کو وہاں چھوڑ خود گرجے کی جانب روانہ ہوئی۔ پی ہیتا اس کی رہائش کے انتظام میں مصروف تھی اور وہ خود گھٹنوں کے بل کھڑی دونوں ہاتھ باندھے دعائیں ہمہ تن مصروف' اس کے دل میں تسلیم و رضا کا ایک نیا جذبہ پیدا ہو رہا تھا۔ جیسے وہ بھی محسوس کرنے لگی۔ شاید کسی وقت وہ یہ جان جاتی کہ وہ اپنی بیٹی اور اپنے دیوتا کو اپنے حال پر چھوڑ دے تاکہ وہ اپنا اپنا کام خود سرانجام دیتے رہیں۔ گرجے کے باہر ایک بوڑھی عورت

سارا دن بیٹھی موم بتیاں بیچتی - دن رات اس کا کام پیسہ پیسہ پکارنا تھا - مگر اس پر بھی خاتون نے ناراضی کا اظہار نہیں کیا - گرجے کے اندر سامان کی محافظ عورت کسی نہ کسی بہانے روپیہ پیسہ جمع کرنے میں مصروف تھی - کبھی وہ ایک نذرانہ مانگتی اور کبھی دوسرا - کئی بار وہ جگہ تبدیل کرتی - اس پر بھی خاتون نے چوں تک نہ کی - یہاں سے وہ باہر نکلی اور فوارہ کے قریب دھوپ میں آ بیٹھی باغ میں معذور لوگ گروہ در گروہ پھر رہے تھے - ہوا میں تین شاہین نیچے جھپٹے - وہ انہیں تکنے لگی - فوارے کے گرد بچے کھیل رہے تھے - وہ خاتون کو حیرت سے دیکھتے اور دوڑ بھاگ جاتے - ایک راہبہ عورت (جس کی لانبی گردن اور چھوٹی چھوٹی آنکھیں تھیں اور وہ سر پر موم کی بھاری ٹوپی پہنے تھی سیڑھیاں اتر کر) اس کے قریب آگئی اور نذرانہ پیش کیا - یہ عورت اپنے اردگرد کے انسانوں میں بہت دلچسپی لیتی تھی - یہاں تک کہ اپنے تئیں وہاں کے لوگوں میں سے ایک سمجھتی تھی - وہ خواہ مخواہ ان کی باتوں میں یوں دخل دینے لگتی - گویا ابھی اس نے ایک بات کہہ کر سارا معاملہ ختم کرا دیا - تھوڑی دیر کے بعد خاتون کے گرد اور بہت سی راہبہ عورتیں جمع ہو گئیں - وہ اس سے پوچھنے لگیں کہ دعا کے دوران میں وہ ہاتھوں کو کیوں ٹکراتی تھی اور پھر بعض اس کے نقاب کی قیمت دریافت کرنے لگیں -

خاتون ماریا آتی دفعہ انتظام کرا آئی تھی کہ جونہی اسپین سے کوئی خط

آئے ۔ایک خاص ایلچی کے ذریعے یہ خط اُسے سفر میں مل جانا چاہیئے ۔ وہ لی ما سے آہستہ آہستہ کتنی دور آپہنچی تھی ۔ اب وہ ایک چوک میں آبیٹھی تھی کہ اس کے اپنے فارم کا ایک ملازم لڑکا بھاگتا ہوا آیا اور ایک بڑا پیکٹ جو کپڑے میں لپٹا اور سر بمہر تھا اس کے ہاتھ میں دے گیا ۔خاتون نے آہستہ آہستہ اس بنڈل کو کھولا اس کی حرکات میں ضبط تھا ۔سب سے پہلا خط اس کے داماد کا تھا ۔اس کا لب ولہجہ محبت بھرا اور مزاحیہ تھا ۔اس کے بعد اس کی بیٹی کا خط تھا ۔اس کی طرز تحریر بڑی شوخ مگر طنز سے بھری ہوئی تھی شاید ذوقِ فن کی خاطر یہ دکھ پہنچانے والی باتیں لکھی گئی تھیں ۔ ہر ایک جملہ خاتون کی آنکھوں میں کھبتا اور پھر فہم وعفو کے پردوں میں لپٹ کر خاتون کے گوشۂ دل میں جاگزیں ہو جاتا ۔ آخر کار وہ اٹھی ۔ ہمدرد لامہ راہبہ کو الوداع کہا اور سنجیدہ چہرہ بنائے مقبرہ کے اندر چلی گئی ۔

خاتون مار یا دو پہر ڈھلنے تک رجی ورچوک میں تھی ۔ اُدھر پی ہیتا سامان درست کراتی رہی ۔ سامان میں بید کا بنا ہوا ایک بڑا ٹوکرا تھا ٹوکرے میں برتن ، قربان گاہ کا مجسمہ ، انگارے ڈھانپنے کا طباق ، منقش پردے اور خاتون کلارا کی تصاویر تھیں ۔اس نے دربان کو ان کے رکھنے کے متعلق ضروری ہدایات دیں ۔اس کے بعد وہ باورچی خانہ میں گئی ۔جہاں باورچی کو خاتون کے مذاق کے مطابق مختلف کھانے بنانے کا کہا ۔تب وہ فارغ ہو کر کمرے میں لوٹی اور خاتون کا انتظار کرنے لگی ۔بیٹھے بیٹھے اُسے خیال آیا کہ وہ بڑی راہبہ کو

ایک خط لکھے۔ چنانچہ وہ لکھنے بیٹھ گئی۔ لیکن کافی عرصے تک وہ قلم پکڑے سوچتی رہی۔ وہ دور کہیں دیکھ رہی تھی اس کے لب کانپ رہے تھے۔ اس کے سامنے بڑی راہبہ کا سرخ اور رگڑا ہوا چہرہ اور اس کی حیرت انگیز سیاہ آنکھیں آگئیں۔ اس کے کانوں میں اس کی وہ آواز جو وہ عشائیہ کے خاتمہ پر سنا کرتی تھی، گونجنے لگی۔ (سامنے یتیم بچے ہاتھ باندھے اور نظریں نیچے کئے بیٹھے تھے) وہ سارے دن کے واقعات پر گفتگو کر رہی تھی۔ بتی کی روشنی میں وہ شفا خانے کے مریضوں کے پاس کھڑی انہیں سوتے وقت خدا کی طرف توجہ کرنے کی تلقین کر رہی تھی۔ لیکن ان سب باتوں سے زیادہ جو بات اُسے یاد آ رہی تھی۔ وہ اس کی ملاقات تھی۔ جب بڑی راہبہ نے اُسے اچانک بلا بھیجا۔ (اس نے لڑکی کی عمر کا بھی خیال نہ کیا) اور پھر وہ اپنے فرائض کا ذکر کرنے لگی۔ وہ پی پیتا سے یوں باتیں کر رہی تھی جیسے دونوں ہم مرتبہ ہوں۔ ایک ذہین بچے کے لئے ایسی باتیں تکلیف دہ اور حیران کن ہوتی ہیں۔ اس نے پی پیتا کی نگاہ کو اتنا وسیع کر دیا کہ وہ اپنی عمر کے لحاظ سے زیادہ بڑی بڑی باتیں سوچنے لگی۔

بڑی راہبہ نے اپنی شخصیت کا پورا پرتو اس پر ڈال دیا تھا۔ پی پیتا کو جب اپنی خامیوں کا احساس ہوتا تو وہ انہیں چھپانے کی کوشش کرتی اور چھپ چھپ کر روتی۔ پھر بڑی راہبہ نے اُسے تنہائی کی آزمائش میں دھکیل دیا۔ یہاں آ کر اُسے کشمکش کرنا پڑی۔ وہ بار بار اپنے تئیں یقین دلاتی تھی۔ کہ اُسے جھلایا

نہیں گیا اور اب اس اجنبی سرائے میں جہاں چاروں طرف عجیب پہاڑیاں کھڑی تھیں، سطح کی بلندی سے اس کے خیالات میں بھی پرواز آگئی۔ اس کا دل بھر آیا۔ وہ تمنا کرنے لگی کہ اس کی مہربان دینی ماں اگر وہاں آجائے تو —— اس کی یاد اُسے ستانے لگی۔

اس نے خط لکھ ہی لیا۔ کاغذ پر جا بجا سیاہی کے دھبے تھے اور تحریر بے ربط تھی۔ وہ اٹھی اور نیچے چلی گئی۔ پھر وہاں سے وہ باورچی خانے پہنچی اور خاتون کے لئے جو فرنی تیار ہوئی تھی اُسے چکھا۔

اس دوران میں خاتون واپس آچکی تھی۔ وہ آتے ہی میز پر جا بیٹھی "میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتی۔ اب کیا ہوگا —— کیا ہوگا" وہ دھیمی آواز میں بولی۔ اس نے گلے سے تعویذ کھولا اور اُسے دھکتے ہوئے انگاروں میں پھینک دیا۔ اس کے دل میں ایک عجیب سا احساس بیدار ہونے لگا۔ گویا وہ خدا کا مقابلہ کر رہی تھی۔ اس کی یہ دعائیں، یہ مناجاتیں تقدیر کو بدلنے کے لئے تھیں یہ مقابلہ ہی تو تھا "معاملہ دوسرے کے ہاتھوں میں ہے۔ مجھے اثر انداز ہونے کا حق بھی کیا ہے۔ لیکن اب ہوگا کیا —— کیا ہوگا" وہ کافی دیر اسی طرح سوچتی رہی۔ اس نے دونو ہاتھوں میں اپنے رخسار دبا رکھے تھے۔ وہ خالی الذہن ہونا چاہتی تھی۔ اچانک اس کی نگاہ پی پیتا کے خط پر پڑی۔ اس نے بے سوچے سمجھے اُسے کھولا اور پڑھنے لگی۔ نصف سے زیادہ پڑھ چکی

جب کہیں مطلب اس کی سمجھ میں آیا۔

"........ آپ کی ایسی ہی مرضی ہے تو میں نہیں ٹھہروں گی۔ لیکن میرے ٹھہرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ خادمہ اکثر مجھے کمرے میں بند کر دیتی ہے اور پھر چیزیں اڑا لے جاتی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ شاید میری مالکن خیال کرے کہ میں چوری کر رہی ہوں۔ مجھے اس کی امید تو نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گی۔ شفا خانے میں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہوگی اگرچہ میں آپ سے دور ہوں۔ مگر آپ کی یاد ہر وقت رہتی ہے۔ جو کچھ آپ نے مجھے کہا تھا۔ ماں! اب مجھے وہ خوب یاد ہے۔ آپ کے ارشاد کی تعمیل میرا فرض ہے میرا جی چاہتا ہے کہ میں چند دنوں کے لیئے آپ کی خدمت میں حاضر ہو سکوں؛ خانقاہ میں رہوں لیکن اگر یہ آپ کو پسند نہ ہو تو پھر نہ سہی۔ میں یہاں بالکل اکیلی ہوں۔ کوئی نہیں جس سے کوئی بات کر سکوں۔ کھل کر بول سکوں۔ بعض اوقات مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آپ مجھے بھول گئی ہیں۔ اگر آپ کو کبھی فرصت ملے تو ایک آدھ سطر اپنی خیریت کی لکھیں تاکہ مجھے تسلی ہو۔ میں جانتی ہوں آپ کو فرصت نہ ہوگی لیکن ......"

خاتون ماریا اس سے آگے نہ پڑھ سکی۔ اس نے خط کو تہ کر کے وہیں رکھ دیا۔ ایک لمحہ کے لیے اس کے دل میں رشک پیدا ہوا۔ کاش وہ بھی کسی کے دل میں اپنی جگہ پیدا کر سکتی۔ وہ صرف اتنا ہی چاہتی تھی کہ اُسے کوئی محبت کرے

بے لوث محبت وہ غرور اور خود پسندی کا بوجھ اٹھائے اٹھائے پھرتی تھی۔ لیکن وہ اُسے اتار پھینکنا چاہتی تھی اس کے دماغ میں ایک طوفان برپا تھا۔ اس کی روک تھام کے لئے وہ دعاؤں کی کتاب لے بیٹھی۔ پڑھنے لگی وہ ایک ایک لفظ کو سوچ سمجھ کر ادا کرتی لیکن اچانک اس کے دل میں خط کو دوبارہ پڑھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ وہ اس راز کو جاننا چاہتی تھی جس کی وجہ سے لڑکی کے دل میں اتنی الفت اور محبت پیدا ہوگئی تھی۔

پلی پیتا خود کھانا اٹھائے اندر داخل ہوئی۔ اس کے پیچھے پیچھے خادمہ بھی تھی۔ خاتون ماریا نے کتاب کے اوپر سے اُسے اندر آتے دیکھا۔ وہ یوں اُسے دیکھ رہی تھی گویا وہ ایک حور تھی جو آسمان سے ابھی نازل ہوئی ہے۔ پلی پیتا حسبِ معمول دبے پاؤں کمرے میں ادھر اُدھر کام کرنے میں مصروف ہوگئی وہ خادمہ سے سرگوشی میں باتیں کرتی اور اُسے مناسب ہدایات دینے لگی

آخرکار وہ بولی "حضور کا کھانا لگ گیا ہے۔"

"میری بچی! آج تم بھی میرے ساتھ کھاؤ۔"

لی ماین عموماً پلی پیتا خادموں کے ساتھ کھانا کھایا کرتی تھی۔

"میں نے سمجھا حضور تھک گئی ہوں گی۔ اس لئے میں نے جلدی کھانا کھا لیا۔"

مگر خاتون نے سوچا یہ میرے ساتھ بھلا کیوں کھانے لگی۔ اس سے

جان بوجھ کر انکار کر دیا ہے۔

"اگر محترمہ اجازت دیں تو میں کچھ پڑھتی رہوں اور حضور کھانا تناول فرما لیں" پی پیتا بولی۔ اُسے محسوس ہو گیا تھا کہ اس نے جواب دینے میں غلطی کی تھی۔

"نہیں! تم اگر سونا چاہو تو اب جا کر آرام کرو۔"

"حضور کا شکریہ"

خاتون ماریا اپنی جگہ سے اٹھی اور کھانے کی میز کی طرف بڑھی۔ ایک ہاتھ کرسی کی پشت پر تھا۔ وہ رکی اور کہنے لگی۔ "میری بچی! میں صبح ایک خط لی ما بھجوا رہی ہوں۔ تمہیں بھی کوئی خط بھیجنا ہو تو دے دینا۔"

"سرکار مجھے کوئی خط نہیں بھیجنا۔" اس نے جلدی سے کہا۔ "میں ذرا نیچے جا رہی ہوں۔ انگیٹھی کے لئے کوئلہ لانا ہے۔"

"لیکن بچی! تم نے ایک خط بڑی راہبہ کے نام لکھ رکھا ہے ...... کیا اُسے نہ بھیجو گی۔"

پی پیتا جان بوجھ کر آگ کریدنے لگی۔ "مجھے وہ خط نہیں بھیجنا۔ میں نے ارادہ بدل لیا ہے۔"

"پی پیتا اُسے تمہارے خط کا انتظار ہو گا۔ میں جانتی ہوں وہ تمہارا خط پا کر خوش ہو گی۔"

پی پیتا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے بلند آواز میں کہا۔ "سرائے کے

مالک نے کہا تھا کہ شام کو نیا کوئلہ آجائے گا۔ ممکن ہے آگیا ہو۔ میں ذرا اُسے کہہ آؤں کہ وہ اوپر ہی بھیج دے۔" اس نے مڑ کر خاتون کی طرف دیکھا۔ ابھی تک دو غمگین آنکھیں اُسے تک رہی تھیں۔ پی پیتا نے محسوس کیا کہ آنکھیں وہ کچھ کہہ رہی تھیں جو زبان نہیں کہہ سکتی۔ خاتون نے اس بات کو ایسی سنجیدگی سے کہا تھا کہ وہ مجبور ہو گئی اور بولی "محترمہ! یہ خط اچھا نہیں لکھا گیا اس لئے میں رک گئی ہوں۔"

خاتون ماریا نے ایک لمبا سانس لیا "میری پیاری بچی! یہ خط بہت سندر ہے۔ میں جانتی ہوں یہ خط کتنا سندر ہے، یقین مانو۔ بھلا یہ خط بُرا کیسے ہو سکتا ہے۔"

پی پیتا کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ وہ اس گفتگو کو ختم کرنا چاہتی تھی۔ اس کے لئے الفاظ تلاش کرنے لگی۔

"میں اسے بھیج دوں ...... جرأت نہیں پڑتی ...." اب وہ اور کچھ نہ کہنا چاہتی تھی۔ اس نے خط اٹھا لیا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ جہاں سے خط پھاڑنے کی آواز سنائی دی۔ تب وہ بستر پر دراز ہو گئی اور اندھیرے میں تکنے لگی۔ وہ بے چین تھی۔ اس نے جس لب و لہجہ میں باتیں کی تھیں۔ اُس نے اُسے اور بھی بے چین کر دیا۔ ادھر خاتون ماریا کھانا سامنے رکھے حیران بیٹھی تھی۔

خاتون نے زندگی یا محبت میں کبھی جرأت نہ دکھائی تھی۔ اس کی آنکھیں

اُس کے دل کو ٹٹول رہی تھیں۔ اُسے گنڈے، تعویذ، تسبیح کے دانے اور اپنا خمار یاد آنے لگا ...... وہ اپنی بیٹی کے متعلق سوچنے لگی۔ ماں بیٹی کئی برسوں تک ایک دوسرے کے ساتھ رہی تھیں۔ اُسے بچھڑی ہوئی سنگت یاد آگئی۔ اس سنگت میں ڈھیروں باتیں دبی چھپی تھیں۔ اب وہ باتیں ایک ایک کر کے اُبھرنے لگیں۔ اُسے وہ وقت یاد آگیا۔ جب وہ بغیر کسی بنیاد کے بیٹی سے ناراض ہو جایا کرتی تھی۔ اُس کے کہے سُننے کو اپنی توہین سمجھتی۔ اُس کی پروا نہ کرتی۔ اور اُس سے الگ تھلگ رہتی۔ بیٹی اس پرانی باتوں کا الزام دھرتی تھی۔ اُس کے اعتقادات بے موقع تھے۔ اُسے وہ وقت بھی یاد آگیا۔ جب وہ غصے میں میز پر ہاتھ مارا کرتی تھی۔ پھر وہ آپ سے آپ باتیں کرنے لگی ”نہیں اس میں میرا کوئی دوش نہیں۔ بیٹی! میں نے جو کچھ کیا اس میں میرا کوئی دوش نہیں۔ حالات ہی ایسے تھے۔ میں جیسی بھی تھی، ویسی ہی بنائی گئی تھی۔ میری پرورش اور تربیت ہی اس طریق پر کی گئی تھی۔ میری بیٹی! اب میں ویسی نہیں ہیں کل سے نئی زندگی شروع کروں گی۔ تم دیکھنا تو سہی۔“

آخر اُس نے میز صاف کر دیا اور خط لکھنے بیٹھ گئی۔ یہ خط اپنے رنگ ڈھنگ کا پہلا خط تھا۔ اس کی غلط اور مطلب اُلجھا سُلجھا سہی اس میں جرأت کی جھلک ضرور تھی۔ ایسی جرأت جس کا اظہار اس نے زندگی میں پہلی بار کیا تھا۔ اُسے وہ خط یاد آگیا جو اس سے پیشتر اُس نے لکھا تھا۔ اس میں التجائیں تھیں اور گڑگڑا کر

بیٹی سے پوچھا تھا :" بیٹی کیا تم مجھ سے پیار نہیں کرتیں۔ بھلا بتاؤ تو کتنا پیار کرتی ہو؟"

اس خط میں اس نے وہ فقرے بھی درج کر دیئے جو کسی وقت اس کی بیٹی نے لکھے تھے۔ ان فقروں میں بیٹی نے بڑی ہچکچاہٹ کے ساتھ ماں سے پیار جتایا تھا۔ اب کے خاتون ماریا نے پرانے ڈھب کا خط نہیں لکھا۔ یہ خط بے باک اور وسیع خیالات لئے ہوئے تھا۔ کہنے والے کچھ کہیں۔ اس میں الجھاؤ نہ تھا صاف اور سیدھا خط تھا۔ یہ خاتون ماریا کا چھپنواں خط ہے۔ اور بڑا مشہور ہے۔ فنی معلومات اکٹھی کرنے والے لوگوں کا خیال ہے کہ اس خط میں خاتون ماریا نے محبت کے بارے میں ایک ایسا پیرا لکھا ہے جس کی وجہ سے یہ خط امٹ ہو گیا ہے۔ وہ پیرا یوں شروع ہوتا ہے :" میری بیٹی زندگی میں ہم ہزاروں آدمیوں سے ملتے ہیں ...."

خاتون ماریا نے خط مکمل کیا۔ تو صبح کی روشنی پھیل چکی تھی۔ اُس نے دروازہ کھولا اور بالکنی پر کھڑی ہو کر ستاروں کو دیکھنے لگی جو کوہ اینڈس کی چوٹی پر چمک رہے تھے۔ رات بھر یہ ستارے چمکتے رہے تھے اور اونچی لے میں گاتے رہے تھے لیکن چند لوگوں کے سوا ان کی آواز سننے والا وہاں کوئی نہ تھا۔

وہ دوسرے کمرے میں گئی۔ ایک بتی لے' پی پیتا کے سرہانے کھڑی ہو گئی اور اُسے دیکھنے لگی۔ پی پیتا سو رہی تھی۔ اُس کے گیلے بال چہرے پر بکھرے تھے۔ خاتون ماریا نے اس کے چہرے سے بال ہٹا دیئے۔ اور بڑبڑانے لگی :" میں جیوں

گی۔ مجھے جینے دو' میں کل سے نئی زندگی شروع کروں گی۔"

دو دن بعد وہ لی ما روانہ ہو گئے۔ جب وہ "سان لوئی کے پل" پر سے گذر رہے تھے پل ٹوٹ گیا اور وہ دھڑام سے نیچے آ رہے ●

ایس تے یان

ایک صبح کی بات ہے۔ سینٹ مریم کی خانقاہ کے باہر خیراتی ٹوکری میں جوڑواں بچے ملے۔ کھلائی کے آنے سے پہلے پہلے دونو کے نام رکھ دیئے گئے۔ دونو کے نام اگرچہ الگ الگ تھے۔ لیکن صورت شکل ایسی ملتی جلتی تھی کہ کسی طور پہچانے نہ جاتے تھے۔ یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ ان کے ما باپ کون تھے۔ جب وہ بڑے ہوئے اور قد کاٹھ اُبھرا تو لوگوں نے دیکھا۔ دونو لڑکے تن کر چلتے تھے۔ چپ چاپ اور اپنے حال میں مگن رہتے تھے۔ یہ دیکھ کر لوگوں نے کہا ہو نہ ہو یہ لڑکے کاسٹلین ہیں۔ اب وہ خانقاہ میں اکیلے اکیلے پھرتے تھے۔ جہاں جی چاہے آتے جاتے تھے اُن کے ما باپ کون تھے اور کہاں سے تھے۔ یہ تو کوئی نہ جانتا تھا۔ لے دے کے خانقاہ کی بڑی راہبہ ہی اُن کی سب کچھ تھی۔ دونو لڑکوں کی دیکھ ریکھ وہی کرتی تھی پچھلے پہر ان دونو کو اپنے دفتر میں بلاتی۔ باورچی خانہ سے کیک منگا کر انہیں کھلاتی اور انجیل سے کہانیاں پڑھ کر سناتی۔ وہ لڑکوں سے بہت پیار کرتی تھی۔ لڑکوں کی سکڑی سمٹی سیاہ آنکھوں میں اپنی آنکھیں ڈال دیتی اور دل ہی دل میں سوچنے لگتی۔ جب یہ لڑکے مرد بنیں گے پھر یہ کیسے ہوں گے۔ اُن کی صورت شکل، چال ڈھال کیسی ہو گی۔ دن بھر جو کام وہ کرتی تھی۔ وہ بھدا اور بے روح تھا۔ اپنی پہلی

سوچ کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی سوچنے لگتی کہ میری زندگی کیسی روکھی پھیکی ہے
دونو لڑکے خانقاہ میں پلتے رہے اور ہوتے ہوتے اس عمر کو آ لگے جب خانقاہ
کی کنواریاں اُن سے کترانے لجانے لگیں۔ اب لڑکوں نے کام کاج کی طرف
دھیان کیا اور شہر میں جتنے گرجے تھے سب میں آنے جانے لگے۔ جہاں بیل باڑیں
بڑھ گئی تھیں انہیں کاٹ کتر کر ٹھیک کیا۔ چڑھاوے کی جگہوں پر لیپ پوچ کیا
یہ تو ایسے کام تھے۔ جو وہ گاہے ماہے کرتے رہتے تھے۔ لیکن ان کے علاوہ سال
میں ایک بار چھت پر بھی گیلے کپڑے کا ہاتھ مارتے تھے۔ تاکہ اوپر کی گرد صاف
ہو جائے۔ اب سارے شہر سے ان کی جان پہچان ہو گئی تھی۔ جب کبھی پادری صاحب
اپنی کتابوں کا بقچہ لئے کسی بیمار کو دیکھنے جاتے تو دونوں میں سے ایک لڑکا ان کے
ساتھ ہوتا۔ جب لڑکے اور بڑے ہوئے تو گرجے کے کام کاج میں ان کا جی نہ
لگا۔ دونو نے لکھنے پڑھنے کو اپنا پیشہ بنا لیا۔ ان دنوں براعظم امریکہ میں گنتی کے
چھاپہ خانے تھے۔ دونو لڑکے تھیٹر کے لئے طربیہ ڈرامے، لوک گیت، اور
تاجروں کے لئے اشتہار لکھ کر اپنی روزی کمانے لگے۔ اس کے علاوہ گرجا گھر
میں پڑھے جانے والے مذہبی گیتوں کی نقلیں بھی کرتے۔

دونو لڑکے چپ چاپ تھے۔ اس لئے کہ اُن کا گھر گھاٹ، نہ ماں باپ، نہ بہن بھائی
بند نہ تھے۔ دونو جڑواں بچے تھے اور ایک عورت نے پال پوس کر انہیں بڑا
کیا تھا اُن کی شکل صورت میں ایسی مشابہت تھی کہ دونو ایک دوسرے کو

دیکھ کر شرما جاتے۔ اُن کی شرم کیسی عجیب تھی۔ لوگ انہیں دیکھ کر ٹھٹھہ مخول کرتے ان پر انگلیاں اٹھاتے لیکن وہ بُرا نہ مناتے تھے۔ جو کچھ لوگ کہتے ہنسی خوشی اُسے جھیل لیتے تھے۔

پہلے پہل جب اُن میں بولنے کی طاقت آئی۔ تو انہوں نے اپنے لئے ایک الگ بولی گھڑلی جب کبھی اکیلے ہوتے۔ اُسی بولی میں باتیں کرتے۔ لوگوں کے بھیڑ بھڑکے میں بھی اپنا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے وہ اسی زبان میں سرگوشیاں کرتے اس زبان کی بناوٹ اسپینی زبان سے بہت مختلف تھی۔ نہ الفاظ مشترک تھے اور نہ نحوی ساخت ایک ایسی تھی۔ لی ما کا بڑا پادری علم اللسان کی تھوڑی بہت سن گن بھی رکھتا تھا نگر نگر کی بولیاں جاننے کا اُسے بہت شوق تھا۔ اس نے ہسپانوی اور لاطینی زبان کے خلط ملط اور اُن کے ادل بدل کا ایک نقشہ بنا رکھا تھا۔ اُس کے پاس پرانے دھرانے گیتوں کا مجموعہ بھی تھا اس کا خیال تھا کہ جب وہ واپس اپنی ریاست کو جائے گا تو اپنا بڑھاپا ان گیتوں کی ترنگ میں گذارے گا۔ جب بڑے پادری کو معلوم ہوا کہ ۔ ولڑکے ایک دوسرے سے ایک عجیب زبان میں بات چیت کرتے ہیں تو اس نے لڑکوں کو بلا بھیجا اور ان کی زبان سمجھنے کی کوشش کی۔ لڑکے اس کی مطالعہ گاہ کے قالین پر کھڑے اس کی ٹھاٹ باٹ کو مٹور مٹور دیکھ رہے تھے۔ بڑے پادری نے کئی سوال پوچھے اور بات سے بات پیدا کرنے کی کوشش کی۔ لیکن کرتے دھرتے بن نہ پڑی۔ اور ہاں تا

کے سوال لڑکوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ پادری نے سوچا شاید لڑکے میرے مرتبہ یا کمرے کی سج دھج سے دبتے ہیں۔ پیار چمکار سے پوچھا۔ دم دلاسا دیا۔ ایک اوپر ایک کئی انجیر چھوڑے۔ لیکن لڑکے گونگے بہروں کی طرح کھڑے رہے۔ اور بڑا پادری تھک ہار کر بیٹھ گیا۔

اُن کی بولی ایک دوسرے سے گہری جان پہچان کی نشانی تھی۔ لیکن جو کچھ کہا جاتا ہے، اس سے جذبات کا پورا پورا اظہار نہیں ہوتا۔ محض "محبت" کہہ دینے سے دل کے اندر چھپا ہوا بے پناہ جذبہ اجاگر نہیں ہو سکتا۔ پھر وہ تو بہت کم بولتے تھے۔ لے دے کے دو تین موقعے ایسے تھے، جب وہ ایک دوسرے سے بات چیت کرتے تھے۔ کھانا، پینا، کپڑا لتا اور اپنے کام کاج کے سوا کہنے سننے کے لئے چوتھی بات نہ تھی۔ ایسے میں بھی ایک دوسرے کی طرف کبھی نہیں دیکھتے تھے۔ جیسے جو کچھ کہنا ہوتا، نظر اٹھائے بغیر کہہ دیتا۔

وہ دونو ایک ساتھ شہر نہ جاتے تھے، اور اگر جاتے بھی تھے، تو الگ الگ راستوں سے۔ لیکن جو کچھ ہوتا تھا، بے کہے سنے ہوتا تھا۔ بے جانے بوجھے راستے بدل جاتے تھے۔ ہر کام آپ سے آپ اپنی ڈھب آجاتا تھا۔ جیسے پہلے ہی ہر بات طے شدہ ہو۔ لیکن ایسا ہی نہیں تھا۔ وہ تو ایک دوسرے سے بات بھی نہ کرتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود دونو میں بڑا پریم تھا۔ جیسے قدرت اپنے معجزے دکھاتی ہے۔ پھر دو پہر اُمس رہے تو بادل گھِر آتے ہیں۔ بادل ٹکرائیں

تو بجلی لہراتی ہے۔ اسی طرح اُن کی چاہت بھی بڑے معجزے دکھاتی تھی۔ ظاہر میں ایک دوسرے کے متعلق کچھ نہ جانتے تھے۔ لیکن دل ہی دل میں بہت کچھ جانتے تھے۔ ایک دل کو دوسرے دل سے اتنا گہرا لگاؤ تھا کہ وقت اور فاصلہ سمٹ کر معدوم ہو جاتے۔ اگر ایک گھر آ رہا ہوتا۔ تو دوسرا اس کے آنے سے بہت پہلے جان لیتا کہ میرا بھائی گھر آ رہا ہے۔

پھر ایکا ایکی دونوں کا من اوب گیا۔ لکھنا پڑھنا چھوڑ سمندر کنارے ایک قصبہ میں آ بسے۔ جہازوں پر سامان لادتے لدا ہوا سامان اتارتے اور دو وقت کی روٹی کما کھاتے۔ اُن کے ساتھ حبشی لوگ بھی کام کرتے تھے۔ لیکن انہیں محنت نہ آتی تھی وہ بس ایک ڈھب کا کام نہ کرتے تھے۔ کبھی باغوں میں پھل پھول توڑنے لگتے۔ کبھی کشتی کھینے لگتے۔ لیکن آٹھوں پہر چپ چاپ رہتے۔ گم سم، خاموش، محنت مشقت نے اُن کے گمبھیر چہروں پر مردانگی اور خانہ بدوشی کا رنگ چڑھا دیا۔ اُن کے بال بڑھ آئے تھے۔ نہ جانے کن وقتوں کے کٹے ہوئے تھے۔ سیاہ بالوں کے جھنڈ تلے اُن کی آنکھیں ایکا ایکی حیران اور افسردہ ہو جاتیں۔ ایک وہی دو جی تھے جو ایک دوسرے کے ہمدرد تھے۔ وہ ایک دوسرے کے بھائی تھے۔ اُن کا ناتا اٹوٹ تھا۔ باقی دنیا بے کانہ تھی۔ بیری تھی اور نہ جانے اس دنیا کا وجود بھی تھا یا نہیں۔

لیکن یہ باتیں زیادہ دیر تک بنی نہ رہ سکیں۔ بھائی بھائی کے ایکا پر

عورت کی محبت کا بھاری بوجھ آگرا۔ اور چاہت کی کڑی ٹوٹنے لگی۔ اب وہ شہر میں واپس آ گئے تھے اور تھیٹر میں پارٹ نقل کرنے کا کام پھر سے سنبھال لیا تھا۔ ایک رات تھیٹر میں لوگ بہت کم تھے۔ مینیجر نے بے ٹکٹ کے انہیں اندر بٹھا دیا۔ تاکہ تھوڑی بہت چہل پہل ہو جائے۔ لیکن جو کچھ دیکھ وہ انہیں پسند نہ آیا۔ اداکاروں کی بات چیت بے یانک نثا ہوشی سے کہیں زیادہ بری تھی شاعری بات چیت کی ایک بگڑی ہوئی صورت معلوم ہوتی۔ اداکاروں کے اونچے لمبے دعوے، شہرت کی خواہشات، محبت کے والہانہ اقرار اور حسین استعارے شیخ چلی کی بڑ معلوم ہوئے۔ وہ اکتا گئے تھے۔ لیکن پھر بھی بیٹھے رہے اداکاروں کے بھڑکیلے کپڑوں اور اسٹیج کے آس پاس جلتی ہوئی بتیوں کو دیکھتے رہے .... جب طربیہ کھیل کا ایک ایکٹ ختم ہو جاتا اور دوسرے ایکٹ کے لئے پردہ اٹھنے میں دیر ہوتی۔ تو درمیانی وقفہ میں ایک ایکٹرس اسٹیج پر آ کر ناچنے لگتی۔ ایسی تتے بان کہنے لگا۔ مجھے کھیل کے پارٹ نقل کرنے میں نہ جانے یہ بات سچ تھی یا اس نے یوں ہی کہہ دی۔ بہر حال وہ جلدی اٹھ کر چلا گیا مینول بیٹھا رہا اور دل ہی دل میں رقاصہ کے متعلق سوچتا رہا۔

سامنے کی اسٹیج اور اس کا پچھواڑہ دونوں بھائیوں کا دیکھا بھالا تھا۔ اسٹیج کے پیچھے گرد سے اٹی ہوئی سیڑھیاں تھیں۔ جن کے راستے دونوں بھائی اپنے مسودے لینے کئی بار اوپر نیچے جا چکے تھے۔ جب کی یہ بات ہے تب

وہاں ایک تنک مزاج لڑکی شیشے کے سامنے بیٹھی جرابوں کی مرمت کرتی رہتی
تھی۔ڈاکٹر اُسے پارٹ پڑھ کرسناتا "تاکہ وہ یاد کرلے۔پہلے پہل جوں ہی دونو
بھائی اُس کے پاس سے گذرے لڑکی کی نگاہیں حیرانی سے پھٹ گئیں لیکن
دوسرے لمحے جوں کی توں ہوگئیں۔لڑکی تاڑ گئی کہ یہ جوڑواں بھائی ہیں اور
دل ہی دل میں اپنی بوجھ پر خوش ہوئی۔دونو لڑکوں کو گھسیٹ کر ایک کمرہ میں
لے گئی۔ساتھ ساتھ کھڑا کیا۔بڑے غور سے ان کا چہرہ مہرہ اور نک سک دیکھا
پھر ایکا ایکی ایس تے بان کے کولہے پر ہاتھ رکھ کر چلا اٹھی)" یہ چھوٹے میاں
ہیں" اس بات کو کئی برس ہوگئے۔دونو نے کبھی اُسے یاد نہیں کیا۔

اس رات کے بعد جب مینول تھیٹر میں اکیلا رہ گیا تھا۔اس پر
جادو سا ہوگیا۔وہ بُری طرح رقاصہ کی محبت میں پھنس گیا تھا۔جب کبھی
کسی کام کالج کے لئے باہر نکلتا۔تھیٹر کے پاس سے ہو کر گذرتا اور رات
رات گئے تک اُن درختوں کے بیچ پھرتا رہتا جس طرف رقاصہ کے سنگار
کمرے کی کھڑکی کھلتی تھی۔یہ پہلا موقعہ نہ تھا کہ مینول پر عورت کی پرچھائیں
پڑی تھی۔اس سے پہلے بھی اُسے عورتیں دیکھتی تھیں۔وہ دونو کونوں میں
ہی پلے بڑھے تھے۔جب وہ سمندر کے کنارے چلے گئے تھے۔وہاں بھی
عورتوں سے ان کی مٹھ بھیڑ ہوتی تھی۔لیکن یہ پہلا موقعہ تھا کہ ایک عورت
اس کے ادراک اور ارادہ پر چھائی تھی۔اب تو اسے اندھی محبت کے

سو اکچھ بھی سجھائی نہ دیتا تھا۔ اس کے سیدھے سادھے' بھولے بھالے انداز'
پیار اور خوشی سے انجان پن' غرضکہ سارے طور طریقے جاتے رہے۔ اس
کی نظر میں خوشی کا مفہوم بھی بدل گیا۔ اب خوشی ایسا سادہ اور عام فہم لفظ
نہ تھا جیسے کھانا اور پینا۔ بلکہ اس میں محبت کے الجھیٹے پڑ گئے تھے۔ اور مفہوم
الجھ ہو گیا تھا۔ اب ایسا سمے تھا۔ جب آدمی اپنا آپ بھول جاتا ہے۔ ماحول
کی ہر چیز سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ کام کاج اور خود اپنی دیکھ بھال بھی چھوڑ
دیتا ہے۔ اس کے ذہن میں صرف ایک خیال چھایا تھا۔ اس کے دل میں
صرف ایک لگن تھی۔ وہ خیال رقاصہ کا خیال تھا۔ اور وہ لگن رقاصہ کی لگن تھی
اگر رقاصہ اس کے جذبات اور اس کی والہانہ پرستش کو پالیتی۔ تو وہ حیران ہوتی
اور ناک بھوں چڑھاتی۔ مینول کی محبت محض پڑھی سنی چیزوں کی نقالی نہ تھی
کسی نے کیا خدا لگتی کہی ہے۔ کہ اگر محبت کا چرچا نہ ہوتا۔ لوگوں میں اس کی سُن
گُن نہ ہوتی۔ تو بہت سے لوگ محبت کے جال میں گرفتار نہ ہوتے مینول
بہت تھوڑا پڑھا لکھا تھا۔ اس نے تھیٹر بھی ایک ہی بار دیکھا تھا۔ تھیٹر
کا ماحول البتہ ایسا ویسا تھا۔ وہاں ایک ہی آواز گونج رہی تھی۔ محبت عبادت
ہے۔ محبت عبادت ہے۔ جو گیت وہاں گائے جاتے۔ اُن میں عورت کی
محبت کا منجھا ہوا عنصر بہت کم ہوتا ——— ۔ مینول آپ سے آپ
باتیں کرنے لگتا " وہ بڑی سندر ہے۔ وہ امیر ہے۔ وہ ذہن رسا کی مالک

ہے۔اس پر تو شہر کا حاکم بھی جان دیتا ہے۔ وہ اس کی محبوبہ ہے۔"

جب وہ اس قسم کی باتیں کہہ چکتا، تو اس کی محبوبہ بظاہر اس کی پہنچ سے باہر ہو جاتی۔ لیکن اس کے چنچل جذبات کی تسکین نہ ہوتی۔ وہ اندھیرے میں درخت سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو جاتا۔ دونو ہاتھ ٹھوڑی کے نیچے رکھ کر اپنے دل کی تیز دھڑکن کو سننے لگتا

ایس تے یان کی زندگی جیسی بھی تھی، خوب بھری پڑی تھی۔ اس کے افکار میں نت نئے لگاؤ کے لئے جگہ نہ تھی۔ وہ اپنے آپ میں مطمئن تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کا دل مینول کے دل سے کم وسیع تھا۔ بلکہ اس کی بناوٹ زیادہ سیدھی سادی تھی۔ اب اُسے وہ راز معلوم ہو گیا جس کے اثر سے عمر بھر چھٹکارا مشکل تھا۔ کمس ترین محبت میں دو فرد ایک دوسرے سے کبھی ایک جیسی محبت نہیں کرتے۔ ایک ہمیشہ زیادہ محبت کرتا ہے اور دوسرا کم۔ شاید دوسرے اوصاف میں دونو ہم پلہ ہوں۔ وہ ایک ایسے اچھے ہوں۔ ایک ایسے خوبصورت ہوں۔ لیکن یہ کبھی نہیں ہوتا کہ دونو کے دل میں ایک جیسی محبت ہو

یہ راز معلوم کر کے ایس تے یان اکیلا اپنے کمرہ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کمرے میں بتی ٹمٹما رہی تھی۔ اس نے دونو ہاتھ ٹھوڑی کے نیچے رکھ لئے اور سوچنے لگا۔ مینول اتنا بدل کیوں گیا ہے۔ مینول کے طور طریق، ہم دونو کی مشترکہ زندگی، بے مقصد اور بے معنی کیوں ہو گئی؟

ایک شام کی بات ہے۔ مینول سڑک پر جا رہا تھا۔ ایک چھوٹا سا لڑکا اس کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ رقاصہ ابھی تم سے ملنا چاہتی ہے۔ مینول اُلٹے پاؤں تھیٹر پہنچا۔ اور رقاصہ کے کمرے میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا چہرہ سنجیدہ تھا جسم تنا ہوا' اور جذبات پر خود فراموشی چھائی تھی۔ رقاصہ اپنے کمرہ میں مصنوعی بالوں کی ٹوپی کو سجا بنا رہی تھی۔ اُسے مینول سے ایک خاص کام تھا اور سوچ رہی تھی کہ کام نکالنے کے لئے تھوڑا بہت نخرہ ضروری ہو گا مینویل کے آنے پر وہ اسی طرح ہاتھ کا کام کرتی رہی اور بولی۔

"تم لوگوں کے خط پتر لکھتے ہو۔ ایک خط مجھے بھی لکھ دو۔ تمہاری مہربانی ہوگی اندر چلے آؤ نا!"

مینویل دو قدم آگے بڑھ آیا۔

"تم تو بھولے سے کبھی مجھے ملنے نہیں آتے' یہ کہاں کی شرافت ہے۔ کم از کم ایک ہسپانوی کو ایسا نہیں ہونا چاہئے بھلا کہو تو مینویل ہو یا ایس تے بان؟"

"مینویل"

"تم کوئی بھی ہو' میرے ساتھ دونو کا برتاؤ ایک ایسا ہے' میرے لئے دونو بے مروّت اور نا مہرباں ہو۔ تم سے تو یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ کبھی کھڑے کھڑے مجھ سے مل جاؤ۔ یہاں وقت کٹنا مشکل ہے۔ دن بھر بھدے بھونڈے مکالمے یاد کرتی ہوں۔ پھیری والوں کے سوا مجھ سے ملنے کے لئے کوئی نہیں آتا۔ اس

لئے کہ میں ایک رقاصہ ہوں ہے نا۔"

یہ باتیں ویسی پُرفن اور چالاکی سے بھری ہوئی نہ تھیں۔ پھر بھی مینویل اُن کے تانے بانے میں اُلجھ گیا۔ اور ایسا اُلجھا کہ بات کرتے نہ بن آئی۔ بس گھور گھور کر اُسے دیکھتا رہا۔ اپنی طرف سے ایک لفظ نہ کہا۔ اور اُسے ہی باتیں کرنے کے لئے چھوڑ دیا۔

"مجھے ایک چٹھی لکھوانی ہے۔ چٹھی بڑی خفیہ ہے۔ خیال تھا تم ہی یہ چٹھی لکھ سکو گے۔ لیکن اب تو یہ ممکن نہیں۔ تم مجھے پسند نہیں کرتے۔ ایسے میں تم سے چٹھی لکھوانا، بھرے بازار میں اپنا ڈھنڈورا پٹوانا ہے۔ بھلا یہ تو کہو مینویل تم مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو۔ کیا تم میرے دوست ہو؟"

"ہاں جناب"

"چلتے بنو" اور ایس نے یان کو بھیج دو، تم دوستوں کی طرح بات چیت بھی نہیں کر سکتے "ہاں جناب"۔ بھلا دوست ایسا کہتے ہیں۔"

دیر تک دونو چپ چاپ کھڑے رہے۔ پھر رقاصہ نے گردن اُٹھائی اور بولی۔

"تم ابھی تک کھڑے ہو اور ویسے ہی بے مروت، جیسے پہلے تھے۔"

"ہاں جناب! میں کھڑا ہوں۔ مجھ پر بھروسہ کریں۔ میں آپ کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ مجھ پر بھروسہ کریں۔"

"اچھا تو مجھے ایک خط لکھ دو۔ چلو وہی سہی، لیکن وعدہ کرو، کہ کسی سے اس کا ذکر نہ کرو گے۔ اور یہ بھی نہ کہو گے کہ خط میں نے لکھے تھے۔ کہو منظور ہے۔"

"ہاں جناب"

"تمہیں قسم ہے کنواری مریم کی قسم۔"

"ہاں جناب"

"اور لی ما کے ولی روزا کی قسم۔"

"ہاں جناب"

"تم نے تو بس ایک ہی رٹ لگائی ہے۔ 'ہاں جناب! ہاں جناب' پھر ایسا نہ کہنا 'بے وقوف نہ ہو' نہیں تو میں ایس تے بان کو بلا بھیجوں گی تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ کوئی بات ضرور ہے۔ تم عجیب بے تکی ہانکتے ہو۔ کوئی تمہیں سن پائے تو یہی کہے کہ ڈھور ڈنگروں کی طرح بے عقل اور بے وقوف ہے لیکن تم بے وقوف نہیں ظاہر میں تو ایسے دکھائی نہیں دیتے۔"

اب مینویل نے ہسپانوی زبان کی طرف رجوع کیا۔ اور غیر ضروری الفاظ پر زور دے کر بولا۔

"میں کنواری مریم کی قسم کھاتا ہوں اور لی ما کے ولی روزا کی قسم کھاتا ہوں کہ ہر وہ بات جس کا تعلق خط سے ہے۔ خفیہ رکھوں گا۔"

"اور ایس تے بان سے بھی نہ کہو گے۔" رقاصہ بیچ میں بول اٹھی۔

"ہاں ایں نے ہان سے بھی خفیہ رکھوں گا۔"

"تب تو خوب ہے"۔ رقاصہ نے ایک میز کی طرف اشارہ کیا اور مینویل سے بیٹھنے کو کہا۔ میز پر لکھنے پڑھنے کا سامان پہلے سے رکھا تھا۔ مینویل میز پر بیٹھ گیا۔ رقاصہ کمرے میں ٹہلنے لگی اور ساتھ ساتھ بولتی جاتی۔ اس کے ماتھے پر تیوریاں چڑھی تھیں۔ بار بار اپنے کولہوں کو ہلاتی تھی۔ پھر دونوں ہاتھ اپنے کندھوں کی طرف لے گئی۔ شال کو جھٹکا دے کر اٹھایا اور اپنے گرد لپیٹ لیا۔ ہاں لکھو۔

"میرے پیارے۔ کرنے والی کو میلا ہوں۔ حضور کے دونوں ہاتھوں کو بوسہ دیتی ہوں اور کہتی ہوں .... نہیں نہیں اسے کاٹ دو دوسرا کاغذ لو اور پھر سے لکھو .... فنکار میکا ویلیاس حضور کے ہاتھوں کو بوسہ دیتی ہے اور عرض کرتی ہے کہ حضور کے دوست مجھے حسد کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ میرے متعلق جھوٹی باتیں مشہور کرتے ہیں۔ یہ سب حضور کی رضامندی اور اجازت سے ہو رہا ہے۔ کیونکہ حضور نے انہیں کھلی چھٹی دے رکھی ہے۔ حضور کے شبہات اور جلاپے کی سہار اب مجھ میں نہیں۔ میں نے ہمیشہ حضور کی دوستی کی قدر کی۔ آج تک کسی ایسے کام کا تصور بھی نہیں کیا جس سے دوستی میں فرق آتا۔ لیکن اس بات کا کیا علاج کہ حضور لوگوں کے کہنے میں آجاتے ہیں اور جھوٹی باتیں فوراً مان لیتے ہیں۔ اب میں کس کس چیز کا ذکر کروں اور کون کون سی بات جھٹلاؤں۔ مجھ سے یہ دھندا نہیں ہونے کا۔" ولیاس فنکار۔ جیسے

لوگ رقاصہ کہتے ہیں۔ حضور کے دیئے ہوئے تحفے واپس کرتی ہے۔ یہ تحفے ایسے ہیں جنہیں دیتے وقت حضور نے واپس نہ کرنے کی شرط نہ لگائی تھی، ان تحفوں کو سینت کر رکھنے میں مجھے کیا خوشی ہو سکتی ہے۔"

رقاصہ اپنے خیالات میں ڈوبی کئی لمحوں تک کمرے میں اِدھر اُدھر پھرا کی۔ پھر اس نے ایک چھلکتی ہوئی نظر اپنے سکرٹری پر ڈالی اور بولی۔ "اسے بھی رہنے دو۔ نیا کاغذ لو اور لکھو ——— "ارے میاں کیا تم پاگل ہو گئے ہو۔ نت نئے بکھیڑے کھڑے کرتے ہو۔ میں پریشان ہو گئی۔ اب نیا شوشہ نہ چھوڑنا۔ خدا تمہیں سلامت رکھے، جمعہ کی رات کو اُسی وقت اور اسی جگہ ملاقات ہو گی۔ میں شاید دیر میں آؤں۔ پریشان جو ہوئی ——— بس کافی ہے۔"

مینوئیل اٹھ بیٹھا!

"تم نے کوئی غلطی تو نہیں کی۔ قسم کھا کر کہتے ہو۔"

"ہاں، قسم کھا کر کہتا ہوں۔"

"تو یہ لو اپنا محنتانہ۔"

مینوئیل نے محنتانہ لے لیا۔

"میں کبھی کبھار تم سے خط لکھوایا کروں گی، عموماً میرے چچا ہی میرے خط لکھتے ہیں۔ لیکن میں نہیں چاہتی کہ ان خطوں کے بارے میں انہیں کچھ بتاؤں۔ اچھا شب بخیر، خدا حافظ!"

"خدا حافظ"۔

مینوئیل سیڑھیاں اتر کر نیچے چلا گیا۔ اور دیر تک درختوں کے بیچ کھڑا رہا' خاموش اور بے دھیان۔

ایس تے یان جانتا تھا کہ اس کا بھائی سدا رقاصہ کے متعلق سوچتا رہتا ہے۔ لیکن وہ یہ نہ جانتا تھا کہ اس کا بھائی رقاصہ سے مل چکا ہے۔ اگلے دو مہینوں میں گاہے ماہے ایک چھوٹا سا لڑکا طرارے بھرتا ہوا آتا اور آ کر پوچھتا "تم مینوئیل ہو یا ایس تے یان؟" اور جب اُسے جواب ملتا کہ "میں ایس تے یان ہوں" تو لڑکا کہتا "اچھا تو مینوئیل کو تھیٹر بھیج دیجئے"۔۔۔ ایس تے یان سوچتا "تھیٹر میں پارٹ نقل کرنے کے لئے بلایا ہے۔ اس کے علاوہ اور کیا کام ہو سکتا ہے"۔ اس کے سوا وہ کچھ سوچ بھی نہ سکتا تھا۔

آدھی رات کا وقت تھا۔ ایس تے یان کمبل اوڑھے بستر میں لیٹا تھا۔ اس کی آنکھیں بتی پر ٹکی تھیں جس کی روشنی میں اس کا بھائی کام کر رہا تھا۔ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ مینوئیل نے اٹھ کر دروازہ کھولا' ایک عورت نقاب اوڑھے داخل ہوئی۔ اس کی سانس اکھڑی ہوئی تھی۔ ہاتھ پاؤں میں اضطراب اور بے چینی تھی۔ اس نے نقاب اتار کر پھینک دی اور جلدی سے بولی

"بھئی جلدی کرو' کاغذ قلم لے کر بیٹھ جاؤ' تم مینوئیل ہو۔۔۔ ہاں' ہاں

مینویل ہی ہو، مجھے ایک خط لکھوانا ہے۔"

ایک لمحے کے لئے اس نے چارپائی کی طرف دیکھا۔ دو چمکدار آنکھیں اُسے گھور رہی تھیں۔ اس نے دھیمی آواز میں کہا "معاف کرنا میں جانتی ہوں رات بہت ہو چکی ہے۔ لیکن اس کے سوا چارہ بھی نہیں مجھے آنا ہی پڑا۔" یہ کہہ کر اس نے مینویل کی طرف دھیان کیا اور اس کے کانوں میں کہنے لگی۔

"لکھو ——— ملاقات کی جگہ پر گئی۔ لیکن تم نہیں آئے۔ میں زیادہ دیر تک انتظار کرنے کی عادی نہیں۔ لی ما میں ایک تم ہی چھیل چھبیلے نہیں۔ تم سے اچھے اچھے لوگ بھی موجود ہیں۔ تمہیں سرخاب کے پر نہیں لگے۔ ذرا سوچو تو، مجھ میں تھوڑا بہت کاسٹایلن خون ہے ہم لوگوں سے اچھی ایکٹرس دنیا جہاں میں نہیں۔ میں تمہارے انتظار میں کھڑی رہی اور تم نہ آئے۔ خیر ایسا موقعہ تمہیں پھر نہیں مل سکے گا۔ میں خوش ہوں اور تمہارے انجام پر ہنستی ہوں۔ ایک ایکٹرس اتنی جلدی بوڑھی نہیں ہوتی۔ جتنی جلدی تم ایسے لڑکے لوگ بوڑھے ہو جاتے ہیں۔"

کمرے میں دھند لکا چھایا تھا۔ بتی کی مدھم روشنی میں کومیلا مینویل پر جھکی اس کے کانوں میں کھسر پھسر کر رہی تھی۔ ایس نے یان لیٹے لیٹے سب کچھ دیکھتا رہا۔ اس خلط ملط اور ارتباط سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دونو

میں گہرے تعلقات ہیں۔

ایس تے بان کو ایسا معلوم ہوا۔ جیسے وہ دنیا کے بے انت پھیلاؤ میں سکڑتا جا رہا ہو۔ لمحہ بہ لمحہ بے حقیقت اور معدوم ہوتا جا رہا ہو۔ اس نے نظر بھر کر محبت کے منظر کو دیکھا۔ محبت کی حسین دنیا کو دیکھا۔ آج تک اُسے محبت کا احساس نہ ہوا تھا۔ وہ اس کے لطف سے ناآشنا تھا۔ ہائے محرومی اس نے دیوار کی طرف منہ پھیر لیا۔

خط ختم ہو گیا' کو میلا خط لے' ایک سکہ میز پر رکھ' کپڑے پھڑکاتی باہر نکل گئی۔ مینوئیل موم بتی لے کر دروازہ تک اُسے چھوڑنے گیا۔ وہ واپس آکر میز پر بیٹھ گیا۔ اس کا جسم میز پر جھکا تھا۔ دونوں ہاتھ کانوں پر تھے اور کہنیاں رانوں پر تھیں۔ وہ رقاصہ کا پجاری تھا۔ وہ آپ سے آپ باتیں کرنے لگا۔ میں اُسے چاہتا ہوں۔ دل و جان سے اس کی پرستش کرتا ہوں۔ وہ بار بار ایک ہی بات کہتا رہا۔ دوسری بات وہ سوچ ہی نہ سکتا تھا۔ اس کی مدھم آواز اور کھسر پھسر اس کی سوچ بچار کے راستہ میں روک تھے۔

وہ گانا چاہتا تھا۔ لیکن گا نہ سکا۔ اس کے سوا جو کچھ اس کے ذہن میں آیا۔ اُس نے کہہ ڈالا۔ اور دل کی بھڑاس نکالی۔ جب اس کا ذہن خالی ہوا۔ تو سوچ بچار کی قوت کام کرنے لگی۔ سب سے پہلے اُسے ایس تے بان کا خیال آیا۔ اُسے یوں سنائی دیا۔ جیسے کوئی رات کی تاریکیوں میں کہہ رہا ہو" مینوئیل جاؤ

اس کا پیچھا کرو، یہاں کیوں ٹھہرے ہو، تم خوش رہو گے۔ دنیا میں ہر ایک کے رہنے کے لئے جگہ ہے۔ تو کیا تمہیں جگہ نہ ملے گی۔ پھر اس کی آنکھوں کے سامنے ایلس نے یان کا ہیولے کھڑا ہو گیا۔

ایک لمحے کے بعد ایلس نے یان غصہ بھری آواز میں بولا۔

"جو کچھ تم نے ابھی ابھی کہا وہ تمہیں نہیں کہنا چاہیئے تھا۔ تم چاہے خط لکھو چاہے نہ لکھو، میں اس کی پروا نہیں کرتا۔ میری خاطر تم اپنا راستہ کیوں بدلو، مجھے اس کام سے سروکار نہیں۔"

"بے وقوف نہ بنو اور سوچاؤ" ایلس نے یان کیا تم سچ مچ بدھی کھو بیٹھے، اُف میرے خدا، تمہیں کس طرح سوجھ آئی کہ وہ باتیں میں نے تمہیں سنانے کے لئے کی تھیں یقین کرو، جو کچھ میں نے کہا ٹھیک نہیں۔ میں نے اس سے تعلق توڑ لیا ہے۔ اُس کے دھندوں کی کیچڑ میں کیوں پھنسوں۔ اس لئے کہ وہ میرے ہاتھ پر دو سکے رکھ دیتی ہے۔ نا! نا! بھائی، یہ کام مجھ سے نہ ہوگا!

"یہ سب کچھ ٹھیک ہے۔ لیکن تم اُسے چاہتے ہو، اس سے محبت کرتے ہو، میری خاطر اپنا خیال نہ بدلو۔"

"اس سے محبت کرتا ہوں، اپنے حواس درست کرو ایلس نے یان تم سودائی ہو رہے ہو۔ میں کیوں کر اس سے محبت کر سکتا ہوں۔ یہ نرا پڑا کاروبار ہے اس میں محبت کا امکان کہاں؟ ذرا سوچو تو اگر ایسا ممکن ہوتا۔ تو وہ مجھے ایسے خط

لکھنے کو کیوں کہتی۔ اور اس طرح ہر بار دو ٹکے میری میز پہ کیوں رکھ دیتی ....
تمہارا دماغ پھر گیا ہے اور کچھ نہیں ایس تے یان۔"

کافی دیر تک دو تو چپ چاپ رہے۔ مینوین اپنے بستر پہ تنہ گیا۔ بتی کے پاس بیٹھ کر ہاتھ سے میز کو ٹھپکتا رہا۔ ایس تے یان چارپائی پر کمبل اوڑھے لیٹا تھا۔ ایک کہنی کا سہارا لے کر اوپر اٹھا اور چلا کر کہا "بے وقوف! سو جاؤ"۔ وہ اپنی خفیہ زبان میں بول رہا تھا۔ اس نئی اذیت اور تازہ دکھ درد نے اس کے غصے میں حقیقت کا رنگ بھر دیا۔ "میں ٹھیک ٹھاک ہوں، مجھے کچھ بھی نہیں ہوا۔"

"میں نہیں سوؤں گا میں باہر گھومنے جا رہا ہوں۔" ایس تے یان نے کوٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"تم باہر نہیں جا سکتے۔ اس وقت دو بج رہے ہیں اور بارش ہو رہی ہے، تم باہر جا کر گھنٹوں گھومتے رہو گے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ سنو ایس تے یان۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تمام بکھیڑا ختم ہو چکا۔ میں اُسے محبت نہیں کرتا۔ تھوڑے سے وقت کے لئے میں نے ایسا کیا تھا۔"

دروازہ کھلا تھا۔ ایس تے یان اندھیرے میں وہاں کھڑا تھا۔ ہر آدمی کی زندگی میں بعض موقعے ایسے آتے ہیں، جب وہ اپنی زندگی کے متعلق بہت اہم فیصلے کرتا ہے۔ اس وقت ہماری بات چیت کا انداز عام انداز سے مختلف ہوتا ہے۔ ایک ایسے ہی انداز میں ایس تے یان نے کہا۔ "میں تمہارے راستے

میں کھڑا ہونا نہیں چاہتا" یہ کہہ کر وہ باہر جانے کے لئے مڑا۔

مینویل اچھل کر بستر سے باہر آ رہا۔ اس کے دماغ میں ایک ہنگامہ برپا تھا اور چاروں طرف ایک آواز گونج رہی تھی "ایس تے پان ہمیشہ کے لئے جا رہا ہے۔ تمہیں اکیلے چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے جا رہا ہے۔" مینویل نے درد بھری آواز میں کہا۔ "خدا کے لئے ایس تے پان خدا کے لئے لوٹ آؤ۔"

ایس تے پان واپس آ کر چارپائی پر لیٹ گیا۔

کئی ہفتوں تک اس واقعہ کے بارے میں بات چیت نہ ہوئی۔ اگلے ہی دن مینویل کو اپنی صفائی کا موقعہ مل گیا۔ شام کے وقت ایک لڑکا رقاصہ کا بلاوا لے کر آیا۔ مینویل نے روکھے پن سے باتیں کیں اور رقاصہ کو کہلا بھیجا کہ اب میں تمہارے خط نہیں لکھوں گا۔"

ایک شام مینویل زخمی ہو گیا۔ اس کا گھٹنا دھات کے ایک ٹکڑے سے ٹکرایا اور گوشت پھٹ گیا۔

دونو بھائیوں نے اپنی زندگی میں لمبی چوڑی بیماری نہ دیکھی تھی۔ ایک آدھ دن سے زیادہ کبھی بیمار نہ رہے تھے۔ لیکن اب تو مینویل کے اوسان چھوٹ گئے ٹانگ سوج کر کپا ہو گئی اور لیٹے لیٹے درد سے کراہنے لگتا۔

ایس تے پان پاس بیٹھا اس کے چہرے کو تک رہا تھا۔ اور دل ہی دل میں اپنے بھائی کی تکلیف کا اندازہ کر رہا تھا۔ اوپر تلے کئی دن اسی حالت میں

بیت گئے۔ ایک دن آدھی رات گئے مینوئل کو ایک حجام کا خیال آیا۔ جو بال بنانے کے ساتھ ساتھ جراحی بھی کرتا تھا۔ ایس تے بان بھاگم بھاگ اس کے ہاں پہنچا۔ دروازے پر دستک دی۔ ایک عورت کھڑکی میں سے سر نکال کر بولی :" میرا خاوند گھر پر نہیں۔ بھور سمے آئے گا۔" ایس تے بان واپس چلا آیا۔ اور دونو بھائی بیٹھ کر دکھ سکھ کی باتیں کرنے لگے۔" یہ تکلیف اب گھڑی پل کی ہے۔ ڈاکٹر کے آتے ہی ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔ ایک دو روز میں یا شاید اس سے کم عرصہ میں مینوئل تم چلنے پھرنے کے قابل ہو جاؤ گے۔"

ڈاکٹر آیا۔ پینے کے لئے دوا اور زخم پر لگانے کے لئے دو تین مرہم تجویز کئے اور چلتے چلتے ایس تے بان سے یہ کہہ گیا کہ ہر ایک گھنٹے کے بعد اپنے بھائی کی ٹانگ پر پن کپڑا رکھو۔ ڈاکٹر چلا گیا۔ تو دونو بھائی دوا کا اثر دیکھنے لگے درد اب کم ہوا کہ ہوا۔ اُن کا خیال تھا۔ طبی سائنس ضرور اپنا معجزہ دکھائے گی۔ لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی' ہر گھنٹے کے بعد ایس تے بان اس کی ٹانگ پر پن کپڑا رکھتا۔ اس وقت درد پہلے سے بھی زیادہ ہو جاتا۔ مینوئل نے بڑی ڈھارس سے کام لیا۔ ہمت بٹور بٹور کر درد جھیلنے کی کوشش کی۔ لیکن کرتے دھرتے بن نہ پڑتی۔ اور بے چارا چارپائی پر تڑپنے لگتا۔ رات ہو گئی' لیکن ایس تے بان اپنے بھائی کی دیکھ بھال میں لگا رہا۔ نو' دس' گیارہ —— ایک گھنٹے کے بعد جب زخم پر پن کپڑا رکھنے کا وقت آتا۔ تو مینوئل کہتا :" ایس تے بان خدا کے لئے

اب کپڑا نہ رکھو۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں۔ مجھے تو محسوس بھی نہیں ہوتا کہ میرے زخم پر کپڑا رکھا گیا ہے۔" کئی کئی ڈھب سے مینویل ایس تے بان کو روکتا لیکن اُس پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ اس کا دل بھائی کی مصیبت دیکھ کر پھٹا پڑتا تھا۔ ہونٹوں پر عزم اور دکھ اپنی کھنڈ گیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھتا۔ تولیہ بھگو کر زخم پر باندھ دیتا اور پھر چپ چاپ پائنتی کے پاس بیٹھ جاتا۔ مینویل اب ہذیان بکنے لگا تھا۔ وہ ایسی ایسی باتیں کہتا جو سوجھ بوجھ کے ہوتے سا تے کبھی نہ کہتا۔

رات کے دو بج گئے۔ مینویل اسی طرح چلاتا اور تڑپتا رہا۔ اس کا درد کم نہ ہوا۔ ایک وقعہ ایسی بے چینی سے کروٹ لی کہ اس کا سر فرش سے آٹکرایا۔ وہ چلا اٹھا: "تم بڑے ظالم ہو ایس تے بان' خدا تمہیں دوزخ میں پھینکے اور ہزاروں کیڑے تمہارے جسم کو نوچ نوچ کر کھائیں۔ لعنت ہو تم پر' سنتے ہو"—— ایس تے بان کے دل کو دھچکا سا لگا۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور بڑے کمرے میں دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ پریشانی سے اس کا منہ کھلا تھا۔ مینویل ابھی تک ہذیان بک رہا تھا۔

"خدا تیرے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کرے۔ سنتے ہو' خدا دنیا کے سارے آرام چین تجھ سے چھین لے۔ مجھے حق حاصل ہے جس سے چاہوں محبت کروں تم میرا راستہ روکنے والے کون ہو' میں رقاصہ سے محبت کرتا ہوں۔ اُسے دل و جان سے چاہتا ہوں۔ وہ بڑی سندر ہے۔ وہ دیوی ہے۔ سنتے ہو ایس تے بان'

سنتے ہو؟"

ہر گھنٹے کے بعد مینویل ہذیان بکنے لگتا۔ الیس تے بان چپ چاپ سنتا رہتا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے بھائی کا دل صاف نہیں۔ اس کا بھائی تکلیف میں ہے اُس کے ذہن میں اگلی پچھلی بہت سی باتیں بھری ہیں۔ بھائی کی باتیں سن کر اُسے صدمہ ہوتا۔ لیکن وہ اپنے کام میں آلکسی نہ کرتا۔ ٹھیک وقت پر اٹھتا۔ جو کرنا ہوتا خاموشی سے کرتا اور پھر اپنی جگہ پر بیٹھ جاتا۔

صبح ہوتے تک مینویل کی حالت سدھر گئی۔ ذہنی ہیجان ختم گیا۔ وہ سنجیدگی سے بولا۔" الیس تے بان! میرے بھائی، میں اب پہلے سے اچھا ہوں پن کپڑے سے واقعی فائدہ ہوا ہے۔ خدا نے چاہا تو کل تک پوری صحت ہو جائے گی اور میں چلنے پھرنے لگوں گا۔ تم کئی راتوں سے سوئے نہیں۔ میری ہی دیکھ بھال میں لگے رہے۔ اب آرام کرو۔ تمہیں زیادہ تکلیف دینا ٹھیک نہیں۔"

"ارے مورکھ! اس میں تکلیف کیسی!"

"الیس تے بان جب تم میرے زخم پر پن کپڑا رکھتے ہو تو میں برا بھلا بہت کچھ کہتا ہوں۔ میری باتوں پر نہ جانا۔ اس وقت میں اپنے آپ میں نہیں ہوتا۔"

ایک طویل خاموشی کے بعد الیس تے بان دھیمی آواز میں بولا۔" بھائی تم کہو تو میں رقاصہ کو بلا بھیجوں۔ کھڑے کھڑے تمہیں دیکھ جائے۔"

"رقاصہ! تم ابھی تک اس کے متعلق سوچ رہے ہو....... وہ یہاں نہیں آسکتی ...... کبھی نہیں آسکتی۔"

ایس تے یان کی تسلی نہ ہوئی اس کے دل میں سوتے ابل رہے تھے لیکن بہنے کے لئے انہیں راستہ نہیں ملتا تھا۔

"مینویل! کیا تم یہ نہیں سمجھتے کہ میں تمہاری محبت کے راستہ میں کھڑا ہوں تمہارے اور رقاصہ کے درمیان میرا وجود ایک دیوار ہے۔ جسے تم پھلانگنا چاہتے ہو۔ لیکن ڈرتے ہو۔ شاید تمہیں یاد ہو میں نے کہا تھا مجھے اس معاملہ سے کوئی لگاؤ نہیں، جو چاہو وہ کرو۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر تم اس کے ساتھ چلے جاتے تو مجھے بہت خوشی ہوتی۔ تمہاری خوشی میری خوشی ہے۔"

"ایس تے یان! اس قسم کی باتیں کیوں کہتے ہو۔ اس چھیڑ چھاڑ سے کیا حاصل۔ خدا گواہ ہے میں نے کبھی اس بارے میں نہیں سوچا۔ اور نہ رقاصہ سے کوئی لگاؤ رکھتا ہوں۔ پرانی باتوں کو بھول جاؤ۔ آخر تم بھولتے کیوں نہیں میں خوش ہوں۔ ہر چیز ویسی ہی ہے جیسی کہ پہلے تھی۔ ہاں اس وقت جب تم میرے زخم پر پن کپڑا رکھتے ہو، میں تلملا اٹھتا ہوں اور نہ جانے کیا واہی تباہی بکتا ہوں۔"

"مینویل، کہنے کو میں یہ باتیں نہ کہوں، لیکن جب میں تمہارے زخم پر پن کپڑا رکھتا ہوں۔ تو تم جوش میں باتیں کرنے لگتے ہو۔ وہ باتیں اسی بارے

میں ہوتی ہیں۔ رقاصہ۔ تمہاری محبت اور میں ......"

"دیکھو نا بھائی وہ باتیں ایسی نہیں کہ تم انہیں دھیان میں رکھو میں خود بھی نہیں جانتا میں کیا کہتا ہوں۔ جب میری ٹانگ میں درد ہوتا ہے تو اس وقت میں اپنے آپ میں نہیں رہتا۔ نہ جانے کیا کچھ کہتا ہوں۔ ان باتوں کا ذمہ دار میں نہیں۔"

"میں تمہاری محبت کے راستہ میں کھڑا ہوں۔ اس کے لئے تم نے مجھ پر پھٹکار بھیجی اور بُرا بھلا کہا۔ اب تو ایسا نہیں کہتے۔"

"خاک ڈالو ان باتوں پر۔ ایسی باتیں کیوں کر سوچتے ہو۔ میں کہتا ہوں تم سودائی ہو گئے۔ تمہاری باتیں ایسی ہی من گھڑت ہیں جیسی فرضی کہانیاں۔ تم کئی روز سے سوئے نہیں۔ میں تمہارے لئے عذاب بنا رہا۔ میری خاطر تم اپنی صحت تباہ کر رہے ہو۔ ایس تے بان میں تمہیں بُرا بھلا کیسے کہہ سکتا ہوں اور تمہاری روح کو دوزخ میں کیوں کر بھیج سکتا ہوں۔ تمہیں تو میرا سرمایہ حیات ہو۔ تمہارے سوا میرا کون ہے۔ ایس تے بان خدا کے لئے ان باتوں کو بھول جاؤ۔ اور دوبارہ ان کا ذکر نہ کرنا۔ آؤ ہم انہیں ہمیشہ کے لئے ختم کر دیں۔ صرف اس وقت جب تم میرے زخم پر پن کپڑا رکھتے ہو۔ میں اپنے آپ میں نہیں رہتا۔ اس وقت کو یاد رکھو ایس تے بان۔"

"اس دفعہ میں پن کپڑا زخم پر نہیں رکھوں گا۔ صرف چھوؤں گا۔ تمہیں

زیادہ درد نہ ہوگا بھلا چھونے سے کیا ہوگا؟"

"مجھے کسی نہ کسی طریق سے اچھا ہونا ہے۔ چاہے وہ طریق کچھ بھی ہو" سنتے ہو الیس نے یان' مجھے جلد تندرست ہونا چاہیئے۔ پن کپڑا چھوؤ نہیں' میرے زخم پر رکھ دو جس طرح پہلے رکھتے تھے۔ اسی طرح اب بھی رکھ دو مجھے صلیب پکڑا دو ـــــ میں قسم کھاتا ہوں' حضرت مسیح کے جسم کی اور ان کے خون کی۔ میرے منہ سے الیس نے یان کے خلاف جو کچھ برا بھلا نکلتا ہے۔ وہ میرے دل کی بات نہیں ہوتی جس وقت میری ٹانگ میں درد ہوتا ہے، میں اپنے آپ میں نہیں رہتا اور ہذیان بکنے لگتا ہوں۔ خدا مجھے جلد اچھا کرے ـــــ یہ لو صلیب ـــــ اسے وہیں رکھ دو اب میں شانت ہوں' میرے زخم پر پن کپڑا رکھو"۔

"یہ دیکھو' بس ٹھیک ہے۔ اس طرح چھونے سے کام ہو جائے گا زیادہ دبانے سے کیا حاصل' کیوں مینوئیل ٹھیک ہے؟"

"نہ' نہ' بھائی' مجھے تندرست ہونا ہے۔ جیسے ڈاکٹر نے کہا' ویسے ہی کرو چھوؤ نہیں۔ اوپر رکھ دو' اس طرح' ہاں' اور دباؤ' اب کے میں ایک لفظ بھی نہیں کہوں گا۔ الیس نے یان' اب میں نہیں بولوں گا"۔

الیس نے یان اور مینوئیل کے پاس پڑوس میں رہنے والے لوگ دونوں بھائیوں کی بولی اور ان کی باتیں سن سن کر بھنا گئے تھے۔ جب دوسری رات

ہوئی۔ تو ساتھ کے کمرے والی کسبی بار بار دیوار پیٹنے لگتی۔ مکان کے نچلے حصے کے لوگ ان کے کمرے کے باہر جمع ہو گئے اور غصے سے چلانے لگے۔ سرائے کی مالکن ادھر آئی اور اپنے مہمانوں سے کہنے لگی "ارے میاں! تم فکر نہ کرو، یہ جھک جھک ابھی ختم ہو جائے گی۔ صبح ہوتے ہی دونوں بھائیوں کو نکال باہر کروں گی۔ ایلس نے یان بتی ہاتھ میں لئے پڑے کمرے میں چلا آیا۔ لوگوں نے جی بھر کر اس پر آوازے کسے اور اپنے دل کا غبار نکالا۔ ایلس نے یان چپ چاپ اُن کی باتیں سنتا رہا لیکن جوں ہی لوگ تھک کر خاموش ہو گئے۔ وہ واپس آکر بھائی کے سرہانے کھڑا ہو گیا۔ اپنا ذہنی ہیجان دور کرنے کے لئے اپنے ہاتھوں کو ایک دوسرے سے رگڑنے لگا۔ مینویل کو اس کی یہ حرکت بُری لگی۔ اس کا غصہ پہلے سے تیز ہو گیا۔ اور وہ رات بھر بڑبڑاتا رہا۔

تیسری رات ایلس نے یان نے پادری کو بلا بھیجا۔ پادری آیا اور رات کے گہرے اندھیرے میں مینویل کے سرہانے کھڑے ہو کر دعا پڑھی۔ اُسی رات مینویل چل بسا۔

مینویل کے مرتے ہی ایلس نے یان گھر بار چھوڑ کر باہر چلا گیا۔ اور دور پاس پھرنے لگا۔ راہ چلتے لوگوں کو مٹور مٹور دیکھتا۔ دو گلیاں بیچ تیسری گلی میں اس کا بھائی لیٹا تھا۔ بے جان، بے حس! لیکن وہ اس کے پاس نہ گیا۔ سرائے کی مالکن جانتی تھی کہ دونوں بھائی خانقاہ میں پیے بڑھے ہیں۔ اس نے

بڑی راہبہ کو اطلاع دی۔ اور مردے کو گور گڑھے میں ڈالنے کے لئے بلا بھیجا۔ بڑی راہبہ نے اس بارے میں ہدایات دیں اور جو کچھ کرنا تھا۔ وہ کیا۔ اب اُسے ایس تے بان کی تلاش ہوئی۔ دیکھتے بھالتے وہیں آ پہنچی جہاں وہ کھڑا تھا۔ وہ بڑی راہبہ کو اپنی طرف آتے دیکھتا رہا اور اِدھر اُدھر نہ سرکا۔ اس کی آنکھوں میں حسرت اور مایوسی تھی۔ جب بڑی راہبہ اس کے پاس پہنچی۔ تو ایس تے بان نے نگاہ دوسری طرف پھیر لی۔

"میرا ہاتھ بٹاؤ، چلو میرے ساتھ اپنے بھائی کو دیکھو۔ کیا تم میری مدد نہیں کرو گے؟"

"نہیں۔"

"کیا کہا! میری مدد نہیں کرو گے؟"

دیر تک وہ تو چپ چاپ کھڑے رہے۔ پھر یکایک بیتی ہوئی باتیں بجلی کی طرح اس کے ذہن میں لہرا گئیں اور بہت دور پہلے کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ اُس وقت دونوں بھائیوں کی عمر پندرہ سال تھی۔ وہ دونوں اس کی گود میں بیٹھے تھے اور وہ حضرت مسیح کی شہادت کا واقعہ انہیں سنا رہی تھی۔ دونوں بھائیوں کی اُفسردہ آنکھیں اس کے ہونٹوں پر ٹکی تھیں۔ مینوئیل بولا: "اگر میں اور ایس تے بان وہاں ہوتے تو حضرت مسیح کو پھانسی نہ ہونے دیتے۔"

"اچھا اگر تم میری مدد نہیں کرتے تو نہ کرو، مگر یہ تو بتاؤ، تم کون ہو مینوئیل

یا ایس تے بان ۔"

"مینویل" ایس تے بان بولا ۔

"اچھا مینویل تو کیا سچ مچ تم میری مدد نہ کروگے بس تھوڑا سا وقت لگے گا

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد ایس تے بان بولا "نہیں ۔"

"مینویل میرے اچھے مینویل کیا تمہیں یاد نہیں جب تم بچے تھے میرے بہت سے کام کیا کرتے تھے ۔ میرے سندیسے لے کر قصبہ میں بھاگے پھرتے تھے ۔ جب میں بیمار ہوتی تم میرے لئے شوربہ پکایا کرتے تھے" بڑی راہبہ نے ایک ہی سانس میں اتنی ساری باتیں کہہ ڈالیں ۔ کوئی اور عورت ہوتی تو یوں کہتی "دیکھو میاں میں نے تمہارے لئے بہت کچھ کیا ہے ۔ کیا وہ باتیں بھول گئے" ۔ لیکن بڑی راہبہ کی باتیں اس سے کہیں میٹھی تھیں ۔

ایس تے بان بولا ۔ "ہاں بڑی بی! مجھے وہ باتیں یاد ہیں ۔"

"مینویل تم دکھ میں ہو ۔ تمہارا بھائی کھو گیا ۔ ایسے سمے مجھ پر بھی بیتے ہیں ایک دفعہ ایسا ہی دکھ میں بھی جھیل چکی ہوں ۔ لیکن رونا بے سود ہے اور افسوس لاحاصل ۔ وہ سب خدا کے بہشتوں میں پہنچ چکے ۔ اللہ میاں کی شرن میں چلے گئے ۔"

اب کے بھی ایس تے بان پر کوئی اثر نہ ہوا ۔ نہ کچھ کہا نہ سنا منہ اٹھا کر ایک طرف کو چل دیا ۔ بیس قدم جا کر ٹھہر گیا اور ادھر ادھر جھانکنے لگا ۔ اس کی حالت

اس کتے کی سی تھی جو اپنے مالک سے بھاگ آیا ہو۔ مالک اُسے بلا رہا ہو لیکن وہ نہ تو واپس جانا چاہتا ہے اور نہ مالک کو ناراض کرنا چاہتا ہے۔

ایس نے یان اپنی ہی دھن میں پھرتا رہا۔ اپنے بھائی کے کفن دفن میں اس نے کوئی حصہ نہ لیا۔ جب جنازہ شہر کے بیچ میں سے گذرا تو ایس نے یان بھی ایک دوسری سڑک کے راستے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ جہاں کہیں چوراہا آتا۔ وہ کسی جنگلی آدمی کی طرح ایک نظر جنازے کو دیکھ لیتا۔ اس کے بھائی کی لاش سیاہ کفن میں لپٹی تھی۔ چاروں کونوں پر دن کے اُجالے میں بھی بتیاں روشن تھیں۔ لوگ مذہبی گیت گا رہے تھے۔ گیت کی لے ڈراؤنی اور لوگوں کی آواز سہمی ہوئی تھی۔

اس طرح دونوں بھائیوں کا ناتا ٹوٹ گیا۔ ایک بھائی ہمیشہ کے لئے آسمانوں پر چلا گیا۔ اور دوسرا بھائی اکیلا رہ گیا۔ کئی ماہ تک لوگوں نے اس واقعہ میں گہری دلچسپی کا اظہار کیا۔ ایک گھر والی اپنی کھڑکی میں سے چٹائی باہر جھاڑتے وقت پڑوسن کو پکار کر کہتی "سنتی ہے بہن کچھ سنا دو بھائیوں میں سے ایک بھائی مر گیا"۔ شراب خانوں میں بیٹھے ہوئے لوگ بھی اس قسم کی باتیں کرتے اپنے سر ہلاتے اور پھر سگرٹ کے دھوئیں میں کھو جاتے۔ دور پاس سے آنے والے مسافر بھی انہیں کا ذکر کرتے۔ ایک کہتا "آج میں نے ینویل کو دیکھا (لوگ ایس نے یان کو مینویل ہی سمجھتے تھے) اس کی آنکھیں جلتے کوئلے کی طرح دھک رہی تھیں۔ دریا کنارے سوکھے ٹیلوں پر پھر رہا تھا"۔ دوسرا کہتا "نہیں

نے اُسے پرانے کھنڈروں میں گھومتے دیکھا"۔ لی ما کا ایک گلہ بان بولا" وہ تو ایک پہاڑی کی چوٹی پر سورہا تھا۔ رات کا وقت تھا۔ آسمان پہ تارے چمک رہے تھے اس کا جسم اوس سے گیلا ہو رہا تھا۔ کچھ ماہی گیروں نے کنارے سے دُور اُسے سمندر میں تیرتے دیکھا۔

کبھی کبھی الیس تے بان کو کام مل جاتا۔ تو وہ کر لیتا تھا۔ کبھی گڈریا بن جاتا کبھی چھکڑے کھینچنے لگتا۔ لیکن جم کر ایک جگہ کام نہ کرتا تھا۔ دو چار مہینوں کے بعد غائب ہو جاتا۔ اور گاؤں گاؤں پھرتا رہتا۔ لیکن پھر پھر کر لی ما میں واپس آجاتا۔

ایک دن وہ رقاصہ کے گھر کی طرف گیا۔ اس کے سامنے کمرے کی کھڑکی کے نیچے کھڑے ہو کر ٹکٹکی لگائے رقاصہ کو دیکھتا رہا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن بے کہے وہاں سے چلا گیا۔ ایک دن خانقاہ کی ایک کنواری لڑکی بڑی راہبہ کے دفتر میں دوڑی دوڑی آئی اور کہنے لگی "مینویل خانقاہ کے باہر منڈلا رہا ہے" بڑی راہبہ باہر کی طرف جھپٹی۔ وہ کئی مہینوں سے سوچ رہی تھی۔ کون سا طریقہ اختیار کروں کہ یہ پاگل لڑکا ڈھب پر آجائے اور پھر سے ہم لوگوں میں رہنے سہنے لگے۔ اس نے اپنا چہرہ متین اور افسردہ بنا لیا اور دروازے میں جا کر دہلیز سے بولی "مینویل میرے بچے"۔ الیس تے بان نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں مایوسی اور افسردگی تھی۔ ایک بار پہلے بھی اسی انداز میں اس نے راہبہ کی طرف دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کتنا

غم تھا۔ وہ کھڑا کھڑا کانپنے لگا۔ راہبہ پھر بولی "میرے بچے!" اور ایک قدم آگے بڑھ آئی۔ ایس تے بان نے پیٹھ پھیرلی اور دوڑتا ہوا یہ جا وہ جا' نظروں سے غائب ہوگیا۔

بڑی راہبہ بھاگم بھاگ اپنے کمرے میں پہنچی۔ ڈیسک کے پاس گھٹنوں کے بل جھک گئی اور غصہ بھری آواز میں بولی "اے داتا! اے سب کے پالنہار کیا میری دعائیں اکارت گئیں۔ کیا میرے سجدے بیکار گئے۔ میں نے بدھی اور گیان مانگا تھا۔ تو نے مجھے کچھ بھی نہ دیا۔ کیا میں ایسی ہی گئی گذری ہوگئی کہ ایک گن بھی مجھے نہیں مل سکتا۔ کیا میرا جیون سدا روکھا پھیکا اور بے پھل پھول کے رہے گا ـــــ کیا زندگی بھر میں یہی کام کرتی رہوں گی۔ اور کام کرنے کی شکتی مجھ میں نہ ہوگی۔" بڑی راہبہ اپنے گنوں کی ٹٹول میں لگی تھی کہ اُسے ایک نئی سوجھ آئی۔ اس نے کپتان آلو راڈو کو بلا بھیجا۔ تین ہفتوں کے بعد کپتان آیا اور وہ دونوں دس منٹ تک ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے۔ بڑی راہبہ بولی "میں نے سنا ہے ایس تے بان کزو میں ہے۔ وہاں کی یونیورسٹی میں کتابیں نقل کرتا ہے۔ تم وہاں جاؤ اور اس سے ملو۔" بات چیت کے دوسرے دن کپتان کزو روانہ ہوگیا۔

کپتان آلوراڈو پیرو کے گنے چنے لوگوں میں سے ایک تھا۔ بڑا شریف' بڑا عجیب اور سدھ بدھ والا۔ وہ سیاح آدمی تھا۔ ایک جگہ جم کر نہ رہتا تھا۔ سدا

سمندر میں پھرا کرتا۔ پھرنے پھرانے سے اس کا چہرہ کلبسیا گیا تھا۔ اس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا۔ جہاں جہاں وہ گیا تھا۔ وہیں کا رنگ اس پر چڑھ آیا تھا۔

اب وہ کزو کے چوک میں کھڑا تھا۔ اس کی ٹانگیں اس طرح کھلی تھیں جیسے وہ پانی میں بہنے والے دو تختوں پر کھڑا ہو۔ ایک پاؤں ایک تختے پر اور دوسرا دوسرے پر۔ اُس کی آنکھیں آس پاس ٹکی تھیں۔ جو کچھ وہ دیکھ رہا تھا' ایسی چیزیں دیکھنے کا وہ عادی نہ تھا۔ اس لئے اس کی آنکھوں میں حیرانی اُبھر آئی۔ وہ سیلانی آدمی تھا۔ سمندر کے پھیلاؤ میں اس کی آنکھیں بے روک ٹوک کام کرتی تھیں۔ وہ دور دور دیکھا کرتا تھا۔ بادلوں کے بیچ میں سے ستاروں کو پہچانتا۔ مینہ آندھی کے دنوں میں کنارے کو ڈھونڈھتا۔ لیکن یہاں چاروں طرف اونچے اونچے مکان تھے نگاہ رک رک جاتی تھی۔ کپتان آلو راڈو باتونی نہ تھا۔ چپ چاپ اپنا کام کرتا تھا پیرو کے لوگ اس کے سوا اور کچھ نہ جانتے تھے۔ ایک بوڑھی خاتون ماریا ہی ایسی تھی جو اس کے متعلق اور باتیں بھی جانتی تھی۔ اپنی بیٹی کے نام ایک خط میں لکھتی ہے۔

"بیٹی یہ خط کپتان آلو راڈو کے ہاتھ بھیج رہی ہوں۔ خط لے کر آپ ہی تمہارے پاس آئیں گے۔ ہو سکے تو وہاں کے جغرافیہ دانوں سے اُن کی جان پہچان کرادو' کپتان آلو راڈو سیدھے سادے اور دل کے صاف آدمی ہیں۔ گھوم پھر کر ساری دنیا دیکھ چکے ہیں۔ سیر و سیاحت میں کوئی آدمی اُن سے لگا نہیں کھاتا بلکہ

رات ہی مجھے اپنے سفر کا حال سنا رہے تھے۔ یہاں وہاں کوئی جگہ ایسی نہیں جو اُن کی نظر سے بچی ہو۔ وہ سمندر جہاں کاہی اُگی ہے۔ وہ سمندر جہاں مچھلیوں کی بھرمار ہے۔ وہ سمندر جہاں برف کے تودے تیرتے ہیں' سبھی اُن کے دیکھے بھالے ہیں۔ بیٹی! اور تو اور چین اور افریقہ کے دریاؤں کی سیر بھی کر چکے ہیں۔ یہ نہ سمجھنا کہ کپتان آلوراڈو بڑے سیاح اور تاجر ہیں۔ ان میں اور بھی خوبیاں ہیں جنہیں بیان کرنا مشکل کام ہے۔ ایک دن میں نے پوچھا آپ اس طرح کیوں رہتے ہیں۔ نہ گھر ہے نہ گھاٹ۔ سال کے بارہ مہینے پانی میں رہتے ہیں۔ انھوں نے میری بات کو ٹال دیا اور کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن جو بات تھی' وہ مجھے دھوبن سے معلوم ہو گئی۔ میری بچی! اُن کے بھی ایک بچی ہے۔ میری بیٹی! اُن کے بھی ایک بیٹی ہے۔ جب وہ چھوٹی سی تھی تو اپنے باپ کے لئے کھانا پکایا کرتی۔ سینے پرونے کا چھوٹا موٹا کام کیا کرتی۔ ان دنوں کپتان دور نہ جایا کرتے۔ میکسو اور پیرو کے آس پاس ہی گھوما کرتے تھے۔ بیٹی انھیں ساحل تک چھوڑنے جاتی' جب یہ واپس آتے تو بھاگی بھاگی اُن کا استقبال کرتی۔ اس کی صورت شکل اور سمجھ بوجھ کے بارے میں کچھ نہیں جان سکی نہ جانے وہ عام لڑکیوں ایسی ہے یا ان میں سے نکلتی ہوئی ہے۔ جب یہ لڑکی ان کے گھر سے چلی گئی تو اُن کی دنیا ہی بدل گئی۔ گھر سونا ہو گیا اور زندگی دو بھر۔ تم کہو گی بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔ لڑکی گھر سے چلی گئی تو یہ ایسے کیوں ہو گئے۔ اپنا گھر لاکھ بُرا ہو' اپنا گھر ہے۔ لیکن بیٹی تم نہیں سمجھ سکتیں۔

ماباپ کے دل کا حال تم نہیں جان سکتیں۔ میں ماں ہوں میں اچھی طرح سمجھ سکتی ہوں
کل رات یہ میرے پاس بیٹھے تھے۔ باتوں باتوں میں لڑکی کا ذکر آ گیا۔ بس اس
وقت اپنا چہرہ دونو ہاتھوں میں دبا لیا نظریں سامنے جلتی ہوئی آگ میں گاڑ دیں اور
بولے "یوں معلوم ہوتا ہے۔ میری لڑکی انگلستان میں ہے۔ دل کہتا ہے ایک نہ
ایک بار ہم ضرور ملیں گے۔"

دونو بھائی کپتان آلوراڈو کی بہت عزت کرتے تھے۔ کچھ عرصہ تک اس
کے ساتھ کام بھی کر چکے تھے۔ تینوں ہمیشہ چپ چاپ کام کرتے تھے۔ بڑ مارنے اور
کام پر اترانے کی کسی کو عادت نہ تھی۔

کزو پہنچ کر کپتان آلوراڈو نے ایس تے یان کا اتہ پتہ پوچھا۔ ایس تے یان
اس وقت ایک باورچی خانے میں بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ کپتان اس کے پیچھے پیچھے
باورچی خانے میں گیا۔ وہاں اندھیرا تھا۔ ایس تے یان نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا تو اپنی
کرسی اس طرف سرکائی جہاں اندھیرا زیادہ تھا۔ اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا
کہ وہ کپتان کے آنے سے خوش ہے۔ کپتان چپ چاپ کھڑا رہا۔ اپنے چہرے
کو ایسا بنا لیا جیسے اس نے ایس تے یان کو دیکھا ہی نہیں۔ وہ اس انتظار میں
تھا کہ ایس تے یان اپنا کھانا ختم کرے تو میں اس سے بات کروں۔ ایس تے یان
نے کھانا ختم کر لیا لیکن بات چیت کرنے کو اس کا جی نہ چاہتا تھا۔ جوں کا توں
اپنی جگہ پہ بیٹھا رہا۔ دل ہی دل میں سوچا کیا کہ کپتان یہاں سے جائے تو اٹھوں

آخر کپتان آپ ہی اس کے پاس چل کر گیا اور کہنے لگا۔

"کہو بھائی تمہارا نام کیا ہے؟ ایس تے بان یامینویل۔ ایک دفعہ تم میرے ساتھ کام کر چکے ہو۔ ہم نے جہاز سے سامان اتارا تھا۔ مجھے پہچانتے ہو نا میں کپتان آلوراڈو ہوں۔"

ایس تے بان بولا: "جی میں آپ کو جانتا ہوں"۔

"تمہارے مزاج کیسے ہیں؟"

ایس تے بان نے دبے منہ کچھ کہا۔

"مجھے ایک مضبوط آدمی کی ضرورت ہے جو بحری سفر میں میرے ساتھ رہے —— کیا تم میرے ساتھ چلو گے —— انگلستان اور روس —— کام سخت ہے۔ لیکن مزدوری بھرپور ملے گی۔ پیرو سے بہت دور جانا ہے تم چلو گے۔ ہیں نا!

ظاہر میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایس تے بان نے کوئی بات سنی ہی نہیں میز پر آنکھیں جمائے بیٹھا رہا۔ آخر کپتان نے بلند آواز میں کہا، جیسے کوئی بہرے گونگے آدمی سے بات کرتا ہے

"میں پوچھتا ہوں کیا تم میرے ساتھ سفر پر چلو گے؟

"ہاں میں جاؤں گا"۔ ایس تے بان نے کہا۔

"بہت اچھے، تمہارا بھائی کہاں ہے۔ وہ بھی ہمارے ساتھ چلے گا"۔

"نہیں ــــــ وہ ہمارے ساتھ نہیں جا سکے گا۔ میرا بھائی وہ تو ـــــ"

"کیوں اُسے کیا ہوا؟ وہ کیوں نہیں جا سکتا۔"

ایس تے یان نے دھیمی آواز میں کچھ کہا اور نگاہ دوسری طرف پھیر لی۔ جو کچھ اس نے کہا کپتان اُسے سمجھ نہ سکا۔ اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے ایس تے یان پھر بولا: "اب مجھے جانا چاہیئے۔ ایک کام کے بارے میں کسی سے ملنا ہے۔"

"میں بھی ساتھ چلوں، تمہارے بھائی سے ملنا چاہتا ہوں، وہ کہاں ہے؟"

"وہ مر چکا ہے"

"اوہو میں تو نہیں جانتا تھا۔ بڑی افسوسناک بات ہے۔"

"ہاں ـــــ مجھے جانا چاہیئے۔"

"تم کون ہو ـــــ؟ تمہارا نام کیا ہے؟ دونوں بھائیوں میں سے کون مرا۔ تم کون ہو؟"

"ایس تے یان"

"تو مینویل مر گیا ـــــ کب کی بات ہے"

"دو چار ہفتے ہوئے اس کے گھٹنے پر چوٹ لگی اور وہ مر گیا۔"

اب دو تو فرش کی طرف دیکھنے لگے۔

"تمہاری عمر کیا ہے ایس تے یان"

"اکیس سال۔"

"تو بات پکی ہوگئی، تم میرے ساتھ جا رہے ہو؟"

"ہاں۔"

"ہم سرد ملک کی طرف جا رہے ہیں۔ سردی سہار سکو گے؟"

"ہاں ——— اچھا میں چلا۔ مجھے شہر میں ایک کام کے بارے میں کسی سے ملنا ہے!"

"الیس تے بان کھانے کے وقت تک چلے آنا۔ دونوں مل کر کھانا کھائیں گے۔ اپنے سفر کے متعلق باتیں کریں گے۔ شراب پئیں گے ——— ضرور آنا سمجھے!"

"ہاں آؤں گا"

"اچھا خدا حافظ"

"خدا حافظ"

دونوں نے مل کر کھانا کھایا۔ ایک دوسرے سے مل کر باتیں کیں اور یہ طے پایا کہ کل صبح ہی دونوں ملاکر پل دیں گے۔ کپتان نے اسے خوب شراب پلائی شروع شروع میں دونوں چپ چاپ شراب پیا کئے۔ اپنا اپنا جام بھرتے، اُسے خالی کرتے اور پھر بھرتے ——— پھر کپتان نے جہازوں کی کہانی شروع کر دی۔ بڑے بڑے بحری راستوں کا حال سنایا۔ کپتان نے الیس تے بان سے قطبی تارے کے متعلق سوال پوچھے۔ لیکن الیس تے بان نے ان کا کوئی جواب

نہ دیا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کہہ کر سوالوں کو اوٹ لیا۔ جب وہ باتیں کرتا تھا تو چاروں طرف گونج اٹھتی تھی۔

"کپتان صاحب ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے کی مجھے عادت نہیں۔ جہاز پر کوئی کام دھام دے دیں چاہے وہ کیسا ہی ہو میں کروں گا۔ اونچے اونچے مستولوں پر چڑھ کر رسے باندھوں گا۔ رات بھر دیکھ بھال کروں گا" اور "ہاں کپتان صاحب آپ جہاز پر مجھ سے میل ملاپ نہ بڑھائیں۔ دوسروں پر یہ ظاہر کریں کہ آپ مجھے جانتے ہی نہیں۔ میرے متعلق کسی سے کچھ نہ کہیں۔ ہاں کچھ نہ کہیں۔ مجھے کام چاہیئے۔ میں تو میز پر بیٹھ کر لکھتے لکھتے اکتا گیا ہوں۔ آپ سمجھ گئے نا۔"

"میں نے سنا ہے ایک دن تم آگ میں کود پڑے تھے۔ ایک گھر کو آگ لگ گئی اور تم شعلوں میں سے کسی کو نکال کر لے آئے۔"

ایس تے بان میز پر جھک گیا اور اونچی آواز میں بولا "ہاں —— لیکن مجھے نقصان نہیں پہنچا۔ آگ سے بچا رہا۔ میں کہتا ہوں ہم اپنے آپ کو مار بھی نہیں سکتے۔ ایسا کرنے کی ہمیں اجازت نہیں۔ یہ تو کوئی الوجھ بات نہیں ہر کوئی جانتا ہے۔ اگر تم جلتے مکان میں کود پڑو تو اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ تم اپنے آپ کو ختم کرنا چاہتے ہو   ہمیں جان بوجھ کر سانڈ کے راستے میں کھڑا نہیں ہونا چاہیئے۔ کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ جانور اپنے آپ کو ہلاک نہیں کرتے۔ انہیں موت کا یقین ہو جائے، پھر بھی وہ جینے کی آس نہیں چھوڑتے

وہ دریاؤں میں کود کر نہیں مرتے   کچھ لوگ کہتے ہیں کہ گھوڑے آگ میں کود پڑتے ہیں، کیا یہ صحیح ہے؟"

"میں تو اسے ٹھیک نہیں سمجھتا"۔

"میں بھی ایسا ہی سمجھتا ہوں۔ ایک دفعہ میں نے کتا پالا تھا —— چلو چھوڑو، ہاں تو کپتان صاحب آپ بڑی راہبہ کو جانتے ہیں"؟

"ہاں"

"جانے سے پہلے میں اُسے ایک تحفہ دینا چاہتا ہوں۔ کپتان آلوراڈو کیا تم میری اجرت مجھے پیشگی نہیں دے سکتے۔ اس کے بعد میں روپیہ نہیں مانگوں گا۔ مجھے ضرورت ہی نہ ہوگی —— مجھے ایک تحفہ خریدنا ہے۔ وہ تحفہ صرف میری طرف سے نہیں ہیں اور میرا ——————" ایس نے یان رک گیا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن کہہ نہ سکا۔ اس کی آواز دھیمی ہوگئی۔ وہ پھر بولا "ایک دفعہ اُسے بھاری صدمہ پہنچا تھا —— اس کا بچہ مرگیا —— اللہ جانے وہ بچہ کون تھا۔ اس نے ایسا ہی کہا۔ میں اُسے ایک تحفہ دینا چاہتا ہوں۔ عورتیں اس قسم کے صدمے برداشت نہیں کرسکتیں۔ لیکن ہم انہیں برداشت کرسکتے ہیں ہم مرد ہیں۔"

کپتان نے کہا "بھائی صبح ہونے دو، ہم دونو بازار جائیں گے اور ایک اچھا سا تحفہ خریدیں گے"۔

ایس تے بان تخنے کے بارے میں دیر تک لمبی چوڑی باتیں کرتا رہا۔ پھر اُسے نیند آگئی اور وہ میز کے نیچے لیٹ گیا۔ کپتان اٹھا اور سرائے کے باہر جو کھلی جگہ تھی وہاں چلا گیا۔ سامنے پہاڑ دکھائی دے رہے تھے۔ آسمان پر ستاروں کا جھرمٹ تھا۔ وہ نظر اُٹھائے اوپر نیچے دیکھتا رہا۔ ایکا ایکی اُسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی لڑکی ہوا میں معلق ہے۔ لڑکی کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اپنی لَے بھری آواز میں بولی ——— "ابا بہت دور نہ جانا! میں تمہاری راہ دیکھ رہی ہوں جب تم لوٹ کر آؤ گے تو مجھے ننھی منی لڑکی نہ پاؤ گے۔ میں جوان ہوں گی ———"

یہی آواز اور یہی باتیں کپتان ہزاروں مرتبہ سن چکا تھا۔ آواز میں کتنا رس تھا، شہد کے سوتے بہہ رہے تھے۔ کپتان ہاہر کھڑا سب کچھ دیکھتا اور سنتا رہا۔ لیکن یہ منظر جلد مٹ گیا ——— پھر وہ واپس آیا۔ ایس تے بان کو اٹھا کر اُس کے کمرے میں پہنچایا اور اس کے پاس بیٹھ کر دیر تک اُسے دیکھتا رہا۔

رات گذر گئی اور صبح ہو گئی۔ کپتان سیڑھیوں کے نیچے کھڑا ہو گیا اور ایس تے بان کا انتظار کرنے لگا۔ ایس تے بان آیا تو وہ بولا: "ایس تے بان! کہو بھئی تیار ہو؟ ہمیں اب چلنا چاہئے"۔

ایس تے بان کی آنکھوں میں ایک ان جانی چمک پیدا ہوئی۔ وہ بڑبڑایا

"نہیں! میں نہیں جاؤں گا ——— میں کبھی نہیں جاؤں گا"۔

"ایں! کیا کہا ——— ایس تے بان تم وعدہ کر چکے ہو"۔

"وعدہ —— لیکن میں اُسے پورا نہیں کرسکتا۔ ایسا ناممکن ہے۔ میں آپ کے ساتھ نہیں جا سکتا۔"

یہ کہکر ایس تے بان پھر سے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

"ایس تے بان، ایک منٹ کے لئے میری بات سنو —— یہاں آؤ۔"

"میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا۔ میں پیرو نہیں چھوڑ سکتا —— پیرو! —— ہاں میں اُسے چھوڑ نہیں سکتا۔"

"ادھر تو آؤ، مجھے کچھ کہنا ہے۔"

ایس تے بان سیڑھیوں سے نیچے اتر آیا۔

"ایس تے بان تم بڑی راہبہ کو ایک تحفہ دینا چاہتے تھے"۔ کپتان نے دبلے منہ سے کہا۔ ایس تے بان چپ چاپ کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں سامنے پہاڑ پر ٹکی تھیں۔ کپتان پھر بولا "ایس تے بان کیا تم بڑی راہبہ کو تحفہ نہیں دوگے۔ شاید یہ تحفہ اس کے لئے بہت کچھ ہو۔ اس کی نظروں میں اس کی بہت قیمت ہو، تم اُسے جانتے ہو —— ایس تے بان تمہیں یہ تحفہ دینا چاہیئے۔"

"بہت اچھا" ایس تے بان نے دھیمی آواز میں کہا۔ اس کا چہرہ کسی گہرے تاثر سے سیاہ ہو گیا۔

"ایس تے بان! سمندر کی سچ مچ اور وہاں کی زندگی پیرو سے اچھی ہے لی ما، کزو اور بیچ کی سڑک تم دیکھ چکے، اب کون سی جگہ ایسی ہے۔ جسے تم دیکھنا

چاہتے ہو۔ پیروں میں رکھا ہی کیا ہے۔ اب ذرا سمندر کی سیر کرو۔ گھومو پھرو اور موج اڑاؤ۔ جہاز میں کام کی کمی نہ ہوگی۔ ایک منٹ بھی بے کار نہ بیٹھو گے۔ میں آپ اس بات کا خیال رکھوں گا کہ تم ہر وقت کام میں لگے رہو ـــــ جاؤ اپنی چیزیں بست باندھو۔ ہمیں چلنا چاہیئے۔"

الیس نے بان اُدھیڑ بن میں لگا تھا۔ اِدھر یا اُدھر۔ اُسے دونو میں سے ایک راستہ چُننا تھا لیکن فیصلہ نہیں کر پاتا تھا۔ اس سے پہلے جب کبھی ایسا موقع آتا۔ مینویل ہی اس بات کا فیصلہ کیا کرتا کہ کون سی بات وہ کریں اور کون سی نہ کریں۔ لیکن وہ موقعے ایسے اہم نہ ہوتے تھے، جیسا یہ تھا۔ الیس نے بان چپکے سے سیڑھیاں چڑھ گیا۔ کپتان اس کا انتظار کرتا رہا لیکن وہ نہ آیا۔ ہار تھک کر اوپر جانے کی ٹھانی اور سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ آدھا راستہ جا چکا تو کھڑا ہو گیا اور کان لگا کر سننے لگا۔ پہلے پہل کوئی آواز سنائی نہ دی۔ پھر شور سنائی دیا۔ کپتان اُسی وقت پہچان گیا کہ یہ شور کیسا تھا۔ الیس نے بان نے چھت کی کڑی سے پلستر اتارا، اب وہ کڑی سے رسہ باندھ رہا تھا۔ کپتان سیڑھیوں پر کھڑے کھڑے کانپنے لگا۔ اس نے آپ سے آپ کہا " شاید اس کے لئے یہی اچھا ہے، میں اُسے تنہا چھوڑ دوں۔ اس کے سوا وہ کیا کر سکتا ہے۔ شاید اس کے لئے یہی اچھا ہے۔"

اُسے پھر شور سنائی دیا۔ اب وہ اپنی جگہ پر کھڑا نہ رہ سکا۔ سیڑھیاں

پھلانگ کر دروازے کی طرف لپکا اور کمرے میں داخل ہو کر ایس نے بان کو پکڑ لیا۔ ایس نے بان چلایا "چلے جاؤ، مجھے چھوڑ دو، اس وقت کمرے سے نکل جاؤ۔" وہ رسے سے لٹک رہا تھا۔ کپتان نے جلدی سے رسہ کاٹ دیا، ایس نے بان اوندھے منہ زمین پر آ رہا۔ "میں اکیلا ہوں ——— میں اکیلا ہوں ——— اُف! میں دنیا میں اکیلا ہوں۔" لیٹے لیٹے ایس نے بان کے منہ سے نکلا۔ کپتان اس کے سر پر کھڑا تھا۔ دکھ درد سے اس کا چہرہ سکڑ گیا اس پر بڑی بڑی جھریاں پڑ گئیں۔ اُسے اپنا بیتا ہوا وقت یاد آ گیا۔ پرانے زخم ہرے ہو گئے من میں سوئی ہوئی چنتا جاگ اٹھی۔ اُسے بات کرنے کا ڈھب نہ آتا تھا۔ وہ تو جل پنچھی تھا۔ دنیا کی گھاتیں وہ کیا جانے۔ پھر بھی ہمت بٹور کر جو کچھ اس سے بن پڑا اس نے کہا۔ نہ جانے زمین پر پڑے ہوئے انسان نے اُسے سنا یا نہیں۔ اس نے کہا "جو کچھ ہمارے بس میں ہو ہم کرتے ہیں۔ کسی نہ کسی طور ہم آگے بڑھتے ہیں۔ جو طریق ہمیں اچھا نظر آئے، اُسے اختیار کرتے ہیں۔ سنتے ہو ایس نے بان۔ تم تو سیلانے ہو۔ بہت پہلے سے یہ باتیں جانتے ہو۔ وقت بھی کبھی رکا ہے۔ وہ تو بھاگا جاتا ہے۔ سدا سے اس کا یہی چلن ہے۔ سدا سے اس کی یہی چال ہے۔ سمے نہیں رکتا۔ وہ کبھی نہیں رکتا۔"

دونوں ماکو روانہ ہو گئے۔ جب وہ "سان لوئی رے" پل کے پاس پہنچے تو کپتان پل پر سے جانے کی بجائے نیچے ندی کی طرف چلا گیا۔

کے پاس سامان تھا اور وہ اپنی آنکھوں کے سامنے کشتیوں کے ذریعے سے اُسے پار بھیجنا چاہتا تھا۔ ایس نے بان پل پر ہو لیا۔ پل ٹوٹ گیا اور پل کے ساتھ ہی وہ بھی نیچے آ رہا۔

پیٔو اور رقاصہ

پیئو اور رقاصہ

خاتون ماریا اپنی بیٹی کے نام ایک خط میں مسخرے چچا پٹو کے متعلق اپنے تاثرات بیان کرنے کی کوشش اس طرح کرتی ہے :۔ "میری جان! میں دن بھر اپنی سبز شہ نشین پر بیٹھ کر تمہارے لئے جوتیاں تیار کرتی رہتی ہوں اور چونکہ میری تمام توجہ صرف سنہرے تاروں میں اُلجھ کر نہیں رہ جاتی اس لئے برابر کی دیوار پر چیونٹیوں کی آنے جانے والی فوج کا اچھی طرح سے مشاہدہ کرتی رہتی ہوں۔ درمیانی دیوار کی اوٹ میں کسی جگہ وہ میرے مکان کو ڈھا دینے کی کوشش میں بڑی تندہی سے لگی ہوئی ہیں۔ ہر تین منٹ کے بعد ایک ننھا سا کاریگر دو تختوں کے درمیان میں ظاہر ہوتا اور لکڑی کا ایک ریزہ زمین پر گرا دیتا پھر وہ میری طرف دیکھ کر اپنی مونچھیں ہلاتا اور اپنے کام میں مصروف ہو جاتا۔ اسی دوران میں اس کے دوسرے بھائی بہن ایک شاہراہ پر رواں ہوتے اور ہر چیونٹی اپنے سامنے آنے والی چیونٹی سے رک کر کچھ سرگوشی کرتی اور پھر دونوں اپنا اپنا راستہ لیتیں اور ایسا معلوم ہوتا کہ ان میں سے ہر ایک کو اپنے کام میں اتنا انہماک ہے کہ وہ نہ تو کسی سے کچھ کہنا چاہتی ہے اور نہ سننا۔ اور دفعتاً مجھے "چچا پٹو" کا خیال آ گیا کیوں؟ وہ بھی تو انہیں چیونٹیوں کی طرح اکثر سرِ راہ رک کر کسی خوش پوش

راہب یا درباری کے نوکر سے کان میں چپکے چپکے باتیں کرنے لگتا تھا جیسے وہ کوئی بہت اہم اور پراسرار بات کر رہا ہو۔ میں اسے اکثر جلدی جلدی کہیں بھاگ کر جاتے ہوئے دیکھا کرتی تھی جیسے وہ کسی کے پاس کوئی بہت اہم پیغام لے جا رہا ہے۔ چونکہ میں بے انتہا کاہل اور عاقبت نا اندیش واقع ہوئی ہوں اس لئے میں نے "پی پیتیا" سے مٹھائی کا ایک ٹکڑا منگا کر چیونٹیوں کے راستے میں رکھ دیا۔ اور پھر میں نے کیفے بزار میں کہلا دیا کہ اگر چچا پٹو رات سے پہلے واپس آجائے تو اسے میرے پاس بھیج دیا جائے۔ اگر وہ آیا تو میں اسے سبزی کھانے والا وہ کانٹا دوں گی جس میں فیروزہ لگا ہوا ہے تاکہ وہ مجھے وہ گیت لکھ کر لا دے جو ڈیوک آف الوا کی تعریف میں لکھا گیا ہے اور جو آج کل ہر کس و ناکس کی زبان پر ہے۔ میری بچی! اطمینان رکھو تمہیں تمام اچھی اچھی چیزیں مل جائیں گی اور دوسروں سے پہلے۔"

دوسرا خط:۔ عزیزہ! تمہارے شوہر کے بعد چچا پٹو دنیا کا سب سے زیادہ دلچسپ انسان ہے۔ اس میں کوئی شک کی گنجائش ہی نہیں ہے کہ تمہارا شوہر اس پر سبقت لے جاتا ہے۔ اس کی گفتگو میں عجیب جادو ہے اور اگر وہ اپنا اعتبار اس طرح سے کھو نہ چکا ہوتا تو میں اسے اپنا سکرٹری بنا لیتی۔ میری تمام خط و کتابت وہی کرتا اور آنے والی نسلیں میری خوش مذاقی کی داد دیتیں۔ لیکن افسوس! مستقل علالت اور بری صحبت نے اس میں ایسا گھن لگا دیا ہے کہ جس سے اسی

ادنی طبقے میں رہنے دوں گی۔ اس کی مثال صرف چیونٹیوں کی ایسی نہیں ہے
بلکہ وہ تاش کی گندی گڈیوں سے ملتا ہے۔ اگر وہ نہاتے نہاتے کئی سمندر
خشک کر دے تب بھی اس میں پہلی سی مٹھاس اور نرمی شاید ہی آسکے۔ لیکن وہ
کتنی اچھی ہسپانوی زبان بولتا ہے اور اس کی باتیں کتنی دلفریب ہوتی ہیں۔ افسوس!
میری بچی۔ دنیا کو یہ ہو کیا گیا ہے کہ اتنے عجیب آدمی کے ساتھ اتنا خراب برتاؤ
کیا جاتا ہے۔ اس کی آنکھوں سے وہی غمگینی ٹپکتی ہے جو ایک گائے کی آنکھوں
سے ٹپکتی ہے۔ جب اس کا بچھڑا اس سے الگ کر دیا جائے۔

پہلے یہ بتلا دینا ضروری ہے کہ چچا پُور رقاصہ کا نوکر تھا۔ اور صرف نوکر ہی
نہیں بلکہ اس کا گانے کا معلم، مشاط، حمامی، کتاب خواں، پیغامبر اور خزانچی، بلکہ افواہ
تھی اس کا باپ بھی تھا۔ وہ اسے اداکاری بھی سکھلایا کرتا تھا۔ ان دنوں یہ خبر
بہت گرم تھی کہ رقاصہ لکھی پڑھی بھی ہے۔ لیکن یہ خبر بالکل بے بنیاد تھی اور
لکھنے پڑھنے کا تمام کام چچا پُو ہی کیا کرتا تھا۔ گرم بازاری کے ایام میں کمپنی ایک
ہفتے میں دو دو یا کبھی تین تین نئے کھیل پیش کرتی تھی جس میں رقاصہ کو اچھے
خاصے طویل اور مشکل مکالمے یاد کرنے پڑتے تھے اور یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔

پچاس سال کے اندر پیرو کی دنیا ہی بدل چکی تھی۔ زندگی نے ایک نیا
روپ بدلا تھا۔ اور علم و ادب نے نیا جنم لیا تھا۔ سنگیت اور ناٹک میں لوگ انتہا
سے زیادہ دلچسپی لینے لگے تھے۔ اور بادشاہ وقت خود بھی شعر و نغمے میں دلچسپی

لیتا اور ان کی سرپرستی کرتا۔ اس میں شک نہیں کہ لی ماد والے اکثر عمدہ عمدہ کھیلوں کے درمیان میں بہت معمولی گیت یا تیز گیتوں میں رقت انگیز نغمے ملا دیتے تھے لیکن وہ بے جا اور لغو تعظیم و تکریم کبھی نہیں کرتے تھے۔ اگر لی ماد والوں کو رزمیہ شاعری پسند نہ ہوتی تو وہ ہرگز یہ گوارا نہ کرتے کہ صرف وقت گزارنے کے لیے تھیٹر چلے جائیں اور اگر کثرت نغمات ان کے مذاق کے خلاف ہوتا تو انہیں ایسی مجلس میں جانے پر کوئی مجبور نہ کر سکتا تھا۔ جب پادری سپین کے مختصر دورے سے واپس آیا تو ہر شخص یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ اپنے ساتھ کیا کیا لایا ہے اور رفتہ رفتہ تمام ملکوں میں یہ خبر مشہور ہو گئی کہ وہ عشائے ربانی کے تحریری نغموں کی کئی ضخیم جلدیں، PALESTRINA، MORALES اور VICTORIA کے بھجن اور TIRSO DE MOLINA، RUIZ DE ALARCON اور MORETO کے دس کھیل لایا ہے۔ اس کے اعزاز میں ایک عام جشن منایا گیا۔ بھجن منڈلی کی درسگاہ اور تھیٹر کے ایکٹروں کی خلوت گاہوں میں سبزیوں اور میووں کے تحائف کا انبار لگ گیا کیونکہ ہر شخص کو ان فن کے رسیا اور خلاق فن کی خدمت کرنے کا بڑا شوق تھا۔

یہ تھا اس تھیٹر کا دور جس میں رقاصہ نے رفتہ رفتہ نام پیدا کر لیا۔ ان کا ذخیرہ اتنا وسیع تھا اور ان کی ہدایت کاری اتنی عمدہ تھی کہ بہت کم کھیل سال میں چار سے زیادہ بار کھیلے جا سکتے تھے۔ ان کے ذخیرے میں سترھویں

صدی کے تمام اسپینی کھیل موجود تھے بلکہ بہت سے تو ایسے بھی تھے جو آج کل ناپید ہو گئے ہیں۔ اکیلے LOPE DE VAGA کے سو کھیل ایسے تھے جن میں رقاصہ اداکاری کر چکی تھی۔ لی ما میں اداکار عورتوں کی تعداد بہت کافی تھی اور ان میں سے اکثر اپنے فن میں کافی ماہر تھیں۔ لیکن رقاصہ اپنا جواب دور دور تک نہ رکھتی تھی۔ لیکن عوام میں اتنی اہلیت نہ تھی کہ وہ رقاصہ کے جوہر کو سمجھ سکیں یا یہ اندازہ لگا سکیں کہ وہ ان کے ملک کی بہترین اداکار تھی۔ وہ صرف میڈرڈ کی اداکار عورتوں کے فراق میں آہیں بھرا کرتے تھے اور انہیں دیکھے بغیر ان کی مبہم اور بے معنی تعریف میں زبان گھستے رہتے تھے۔ صرف ایک آدمی کو رقاصہ کی عظمت کا احساس تھا اور وہ چچا پیٹو تھا۔

پیٹو کیسٹیل کے خاندان کا ایک ناجائز فرد تھا۔ دس سال کی عمر میں وہ اپنے باپ کی جاگیر سے میڈرڈ بھاگ گیا۔ گھر والے بھی اس کی یوں ہی سی تلاش کرنے کے بعد اس کی طرف سے صبر کر کے بیٹھ رہے۔ اس کے بعد وہ کبھی کسی دوسرے کا دست نگر نہیں ہوا۔ اس میں جاں بازی اور مہم جوئی کی تمام صفات بدرجۂ اتم موجود تھیں یعنی وہ دوسرے کے نام اور صورتیں اچھی طرح سے یاد رکھتا تھا اور خود اپنی صورت بدلنے میں اسے کمال حاصل تھا۔ اسے اپنی زبان پر پورا پورا قابو حاصل تھا۔ اس کی جدت طبع لازوال تھی، وہ راز کو راز رکھ سکتا تھا اور اجنبیوں سے بہت جلد گھل مل جاتا تھا اور اونگھتے ہوئے رؤسا کے مال و دولت ہضم کر

جانے کے بعد اس کا ضمیر اسے کبھی ملامت نہیں کرتا تھا۔ دس سے پندرہ سال کی عمر تک اس کی آمدنی کا ذریعہ سوداگروں کے اشتہار بانٹنا۔ بازاروں میں امراء اور رؤسا کے گھوڑے پکڑ کر کھڑا ہونا اور خفیہ پیغامات لے جانا تھا۔ پھر پندرہ سے بیس سال تک کی عمر اس نے سفری سرکسوں کے لئے ریچھ اور سانپ پالنے میں گذاری یا شراب بناتا تھا اور بڑے بڑے شراب خانوں کے دروازوں کا چکر لگایا کرتا تھا۔ اور آنے جانے والوں کو ادھر ادھر کی افواہیں سنایا کرتا یا کسی مفلوک الحال رئیس کا سامان اونے پونے بکوا کر خود بھی کچھ کمیشن حاصل کر لیتا۔ اس کی پہنچ شہر کے تمام تھیٹروں میں تھی۔ کیونکہ وہ اکیلا دس آدمیوں کے برابر تعریف کر سکتا تھا۔ اس کے منہ سے نکلے ہوئے افترا پردازی کے قصے ہر جگہ آگ کی طرح پھیل جاتے۔ لوگوں کو فصلوں اور اراضیات کی قیمتوں کی اُڑتی پڑتی خبریں سنا کر وہ اچھی خاصی رقم پیدا کر لیتا تھا۔ بیس سے تیس سال کی عمر تک اس کا رسوخ اعلیٰ ترین طبقوں میں پہنچ گیا تھا۔ خود حکومت نے اسے سرکش سرحدی قبائل میں بھیجا تاکہ وہ انہیں بغاوت پر اُکسائے اور حکومت کو اس کا موقع مل جائے کہ وہ انہیں اچھی طرح سے کچل دے۔ وہ اتنا دانا آدمی تھا کہ آسٹرین پارٹی کے لوگ یہ جانتے ہوئے کہ وہ اُن کی مخالف فرانسیسی پارٹی کا آدمی ہے اس پر بھروسہ کرتے رہے۔ وہ اتنا ہر دلعزیز تھا کہ شہزادی ارسن نے اس سے ملنے کے لئے کئی بار چوری چھپے اسے شاہی محل میں بھی بلوایا تھا۔

اس کی زندگی کا یہ دور ایسا تھا کہ وہ صرف بڑے بڑے آدمیوں کا تختہ مشق بن کر یا بدگوئیاں کرکر کے اپنا گزارہ نہیں کرتا تھا۔

اس کی فطرت میں تلون اس حد تک تھا کہ وہ اچھے سے اچھا کام بھی لگاتار دو ہفتے سے زیادہ نہ کرتا تھا۔ وہ بہت آسانی سے کسی سرکس کا مینجر، کسی تھیٹر کا ہدایت کار، قدیم اور نایاب اشیاء کا سوداگر، اطالوی ریشم کا تاجر، کسی بڑے درباری یا پادری کا سکرٹری، سامان رسد کا بیوپاری، ایک کامیاب سٹے باز، یا عیاش تاجر بہت آسانی سے بن سکتا تھا۔ لیکن اس کی طبیعت بلکہ شاید اس کی قسمت ایسی تھی کہ وہ ایک حالت پر قائم ہی نہیں رہ سکتا تھا۔ حرص تو اسے چھو بھی نہ گئی تھی۔ اور نہ اس میں اتنا صبر و تحمل تھا کہ وہ ایک کام، ایک بات یا ایک حالت پر قائم رہ سکے۔ اور غالباً یہی وجہ تھی کہ اس نے چوری کبھی نہ کی تھی اور اگر وہ کبھی چوری چھپے کسی کی کوئی چیز لے بھی اڑتا تو وہ چیز اتنی معمولی ہوتی کہ آخر میں اسے پچھتانا ہی پڑتا اور اسے اپنی اس حرکت میں نفع سے زیادہ نقصان نظر آتا۔ پولیس والوں کو چکمہ دینے میں اسے کمال حاصل تھا۔ لیکن اس کے دشمنوں کو اس کے متعلق افواہیں پھیلانے اور اسے بدنام کرنے سے کوئی نہ روک سکتا تھا۔ اس نے کچھ دنوں تک عدالت استیصالِ الحاد کے لئے تفتیشیں بھی کیں لیکن جب اس نے دیکھا کہ اس کے بہت سے شکار اس کے جال سے بچ نکلے تو خود اسے اپنی ذات کی طرف سے اندیشہ پیدا ہو گیا کیونکہ وہ خود اس جال میں

پھنس سکتا تھا اس لئے مجبوراً اس نے یہ کام بھی ترک کر دیا۔

بیس سال کی عمر کے لگ بھگ پہنچ کر یہ اچھی طرح سے محسوس کرنے لگا کہ اس کی زندگی کے تین مقاصد ہو سکتے تھے۔ اس کی پہلی اور سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ وہ آزاد زندگی بسر کرے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کی یہ بھی تمنا تھی کہ اس کا تلون، اس کی رازداری اور ہمہ دانی اور ہمہ بینی بھی قائم رہے۔ وہ زندگی کی وجاہت اور آن بان قربان کرنے کو تیار تھا، بشرطیکہ وہ اتنی بلندی پر پہنچ جائے جہاں سے عام لوگ بہت حقیر اور کم مقدرت نظر آئیں عوام کے متعلق وہ تمام باتیں معلوم کرے جنہیں وہ خود نہیں جانتے۔ اور وہ ان کی زندگیوں میں اتنا دخیل ہو جائے جتنا خود انہیں اپنی زندگیوں میں دخل نہیں اس درجہ پر وہ صرف اس لئے پہنچنا چاہتا تھا تاکہ حکام اور بڑے بڑے آدمیوں میں اس کا اثر اور رسوخ پیدا ہو جائے۔ اس کی دوسری خواہش یہ تھی کہ وہ حسین اور خوبصورت عورتوں کے پاس رہے۔ کیونکہ وہ ان کا بہترین اور ایک حیثیت سے ان کا بدترین رسیا اور پجاری تھا۔ حسین عورتوں کا قرب وہ اتنا ضروری سمجھتا تھا جتنا زندگی کے لئے سانس لینا۔ اس کی اس تمنا کا علم ہر کس و ناکس کو تھا اور اکثر لوگ اس کا مذاق بھی اڑایا کرتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود بھی تھیٹر دربار اور تفریح گاہوں کی عورتیں اس کے ذوقِ سلیم کی بڑی مداح تھیں۔ وہ اسے چھیڑتی بھی تھیں، اس کی توہین بھی کرتی تھیں، ضرورت کے وقت اس

سے مشورہ بھی لیتی تھیں۔ اور اس کی احمقانہ محبت سے لطف اندوز بھی ہوتی تھیں
وہ ان کا غصہ اور ان کی کمینی اور ذلیل حرکتوں کے ساتھ ہی ساتھ ان کے محبت
کے آنسو بھی برداشت کرتا تھا۔ لیکن اس کی تمنا صرف اتنی تھی کہ انہیں اکثر بار
ملتا رہے' وہ اس پر بھروسہ کریں اور وہ آزادی کے ساتھ ان کے پاس آتا جاتا
رہے' اپنی احمقانہ حرکتیں کرتا رہے اور ان کے میر منشی کے فرائض انجام دیتا رہے
وہ ان کے احساسات اور جذبات کا مطالعہ بڑی مشتاق نگاہی سے کرتا لیکن
اس نے کبھی ان کے "آغوشِ محبت" کی ہرگز تمنا نہیں کی۔ اس کے لئے وہ شہر
کے گمنام حلقوں میں جا کر اپنی بھڑاس نکال لیا کرتا تھا۔ اپنی ذرا ذرا سی مونچھوں'
گچھے دار داڑھی اور بڑی بڑی مضحکہ خیز لیکن غمگین آنکھوں کے باوجود اس
میں ایک عجیب دلکشی تھی۔ اسی وجہ سے مذہبی حلقوں میں اس کا رسوخ
بہت زیادہ تھا اور اس کے نام کے پہلے چچا کا لفظ ہمیشہ کے لئے
لگ گیا۔ لیکن یہ لفظ انہیں حسین عورتوں نے ودیعت کیا تھا۔ اس کے
کردار کی بلندی عام طور سے اس وقت ظاہر ہوتی جب ان عورتوں پر
کوئی مصیبت پڑتی' جب ان پر برے دن آتے تو وہ ان کی مالی امداد
کرتا جب وہ بیمار پڑتیں تو اس کی دبی ہوئی محبت جوش میں آجاتی۔
مصیبت کے وقت جب ان کے عشاق بے وفائی سے پیش آتے تو
وہ ان کی ہر امکانی مدد کرتا۔ جب بیماری یا عمر طبعی ان کے حسن کی بہار

کو خزاں سے تبدیل کر دیتی تو عمر رفتہ کی یاد اسے یاران کی امداد پر اکساتی رہتی اور جب وہ اس دنیا سے رخصت ہو جاتیں تو وہی اکیلا ایسا شخص تھا جو ان کے لئے صحیح معنوں میں آنسو بہاتا اور سوگ مناتا۔

اس کی تیسری تمنا یہ تھی کہ اسے ہسپانوی ادب کے شاہکاروں خصوصاً ہسپانوی ناٹک کے دلدادگان کا قرب حاصل رہے ۔ وہ اپنے سرپرستوں کے کتب خانوں سے کتابیں مانگ مانگ کر اور ضرورت پڑنے پر چرا کر ہسپانوی ادب کا مطالعہ کرتا۔ رات کے سناٹے میں جب تمام دنیا محوِ خواب ہوتی تو وہ کسی گوشۂ تنہائی میں اپنا دامن ادب کے جواہر پاروں سے بھرتا ہوتا۔ یہ اس کی مجنونانہ زندگی کے ہاؤ ہو کا خاموش اور پُر اسرار پس منظر تھا۔ وہ ان امراء اور روساء سے بے انتہا نفرت کرتا تھا جو پڑھے لکھے ہونے کے باوجود ادبیت سے بے بہرہ تھے ۔خود اسے شعر کہنے کا بے انتہا شوق تھا اور خود اسے بھی اس کی خبر نہ تھی کہ اس کے بہت سے طنزیہ گانے جو اس نے ناٹکوں کے لئے لکھے تھے گھر گھر اور گلی گلی بلکہ شہر شہر اور گانو گانو گائے جاتے تھے۔

قحبے خانے کی ایک لڑائی نے جو عام طور سے وہاں ہوتی رہتی ہیں اس کی زندگی میں بہت سی پیچیدگیاں پیدا کر دیں اور وہ پیرو چلا گیا اور وہاں پہنچ کر اس کی شہرت میں چار چاند لگ گئے ۔ وہاں بھی اس نے اپنا پرانا کاروبار جاری رکھا۔ وہاں تفریح گاہوں کا چکر، وہی باغیوں اور شوریدہ سروں کو اکسانا اور

ٹھکانا اور وہی پرانی اور نایاب چیزوں کا شوق۔ اس نے وہاں جہاز پر سے سامان اتارنے کی مزدوری بھی کی اور چینی کے خوشنما پیالوں کی تجارت بھی کرتا رہا۔ پھر اسے شاہی دربار میں بار مل گیا اور شاہی طبیب بن بیٹھا۔ چار ماہ کے اندر وہ اتنا مشہور ہو گیا کہ لی ما کے تمام لوگ اسے جان گئے۔ پھر اس نے اپنے دوستوں کا حلقہ اور وسیع کرنا شروع کیا اور جلد ہی ساحلی علاقوں کے تمام لوگ کانوں کے قلی اور مزدور اور دور دراز کے علاقوں کے بسنے والے اس سے بہت اچھی طرح سے واقف ہو گئے۔ لوگ روز بروز اس کی ہمہ دانی اور ہمہ بینی کے قائل ہوتے گئے۔ اس علاقے کے حاکم کو بھی اس کی قابلیت اور دانائی کا احساس ہوا اور اس نے کئی انتظامی امور بہت عمدگی سے سرانجام دیئے۔ لیکن وہاں کا حاکم کافی بوڑھا ہونے کے باوجود خفیہ پیغام رسانی کرنے والے آدمیوں کو قابو میں رکھنا بہت اچھی طرح سے جانتا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ کس قسم کے آدمی سے کیسا پیغام بھیجنا چاہیئے اور کس اور کہاں کس سے کیسا کام لینا چاہیئے

ٹپو کو تعجب تھا کہ اس کا مالک شہزادہ ہو کر اس کی اہمیت کا اندازہ نہیں لگا سکتا اور دوسروں پر اپنی طاقت اور عظمت کا سکہ بٹھانے کا موقع نہیں دیتا۔ پھر بھی وہ اپنے مالک سے محبت کرتا تھا کیونکہ ہسپانوی ادب پر اسے کافی عبور حاصل تھا اور اس کے لب و لہجے سے معلوم ہوتا کہ کیسٹیل سے اسے بھی تعلق رہا ہے اکثر ایسا ہوتا کہ صبح وائسرائے کے محل میں داخل ہوتے وقت اسے کسی پادری

یا کسی محرم راز ملازم کے علاوہ اور کوئی راستے میں نہ ملتا۔ اور خود وائسرائے کے ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کرتا۔

لیکن اس کے باوجود بھی پیُو کی دولت میں کوئی اضافہ نہ ہو سکا۔ جب کوئی منفعت بخش کام عروج پر پہنچتا تو وہ اسے فوراً چھوڑ دیتا۔ اور اس کی خبر بہت کم لوگوں کو تھی کہ وہ ایک مکان کا مالک بھی تھا۔ اس کے مکان کی نچلی منزل میں کتے بھرے ہوتے جن کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا رہتا اور اوپر کی منزل پالتو چڑیوں کے لئے مخصوص تھی۔ وہ اپنی اس چھوٹی سی سلطنت میں بالکل تنہا رہتا تھا۔ لیکن وہ اپنی اس تنہائی پر بہت نازاں تھا۔ گویا کہ اس عزلت گزینی نے کوئی خاص عظمت بخش دی تھی۔ آخر کار اسے ایک ایسا موقع مل ہی گیا جس نے اسے یقین دلا دیا کہ اب اس کے زندہ خواب صرف خواب ہی نہ رہ جائیں گے بلکہ ان کی تعبیر بھی ہو سکے گی اور اس کی تینوں تمنائیں یعنی زندگی میں بلندی و عظمت، حسین عورتوں کی محبت اور ہسپانوی ادب کا مطالعہ پوری ہو سکیں گی۔ اس کی ملاقات رقاصہ سے ہو گئی۔ اس نے رقاصہ کو پہلی بار ایک قہوہ خانے میں دیکھا۔ پیُو قہوہ خانے کی دلچسپیوں کا روح رواں ہوتا تھا۔ ایک بار وہ ستار نوازوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور رقاصہ بڑی بھونڈی آواز میں گا رہی تھی اور وہ گا کیا رہی تھی اس سے پہلے گانے والیوں کی نقل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ یکایک پیُو کو ایک خیال آیا۔ اس نے رقاصہ کو اس کے مالک سے

خرید لیا۔ پہلے تو اس نے رقاصہ کو کچھ دنوں تک شراب کے گودام میں بند کر دیا۔ اسے وہیں رہنا اور وہیں سونا بھی پڑتا تھا۔ پھر اس نے چند نئے گیت لکھے اور رقاصہ کو انہیں گانا سکھلانے لگا۔ اس نے رقاصہ کو نئے کپڑے بھی بنوا دیئے۔ رقاصہ کو بہت تعجب تھا کہ اس کا مالک اس کے ساتھ بہت نرمی کے ساتھ پیش آتا تھا اور اسے کوڑے مارنے کے بجائے اچھے اچھے کھانے کھلاتا اور فن کی تعلیم دیتا تھا۔ لیکن رقاصہ سے کہیں زیادہ حیرت پیُو کو تھی۔ اس کی جلد بازی کا تجربہ خلاف توقع بہت زیادہ کامیاب ثابت ہو رہا تھا۔ بارہ سال کی چھوٹی، خاموش اور اُداس لڑکی اچھی طرح سے اپنے سبق یاد کر لیتی۔ اس نے اسے اداکاری اور نقالی کے تمام سبق بڑی جانفشانی سے یاد کر لئے۔ اس نے گاتے وقت کسی مخصوص گانے کے ماحول کو پیدا کرنے کی بھی تعلیم دی پھر وہ اسے تمام ناٹکوں میں لے جا کر اداکاری کے تمام عملی پہلوؤں اور ان کی باریکیوں کا مشاہدہ کراتا۔ لیکن پیُو کو سب سے زیادہ حیرت اس وقت ہوئی جب رقاصہ ایک عورت کی حیثیت سے اس کے سامنے بے نقاب ہوئی رقاصہ کی ہیئت کذائی بہت جلد تبدیل ہو گئی۔ اس کی صورت سے تمکنت اور وقار ٹپکتا تھا۔ اس کا کھردرا، بھدا اور پھوہڑ چہرہ حسین بن گیا۔ اس کی فطرت میں ایک عجیب نرمی، رازداری اور متانت پیدا ہو گئی۔ خود رقاصہ کو بھی اپنے مالک میں کوئی نقص یا عیب نظر نہ آتا تھا اور وہ اس کے احکامات کی تعمیل بڑی فرمانبرداری سے کرتی تھی۔ وہ

ایک دوسرے سے بے انتہا محبت کرتے تھے لیکن دونو میں سے ایک میں بھی جذباتی ہیجان نام کو نہ تھا۔ اگر کبھی وہ رقاصہ کے جسم سے بہت قریب ہو جاتا تو رقاصہ کے چہرے پر ایک ہلکی سی گھبراہٹ نظر آتی اور ایسا معلوم ہوتا کہ ایک ہلکا سا سایہ اس کے چہرے پر نمودار ہو کر فضا میں کھو گیا۔ لیکن یہ عالم ہُو کے دل میں رقاصہ کی عزت و عظمت کا احساس اور بڑھا دیا کرتا۔ آپس میں تھوڑا تھوڑا کھنچا رہنے سے وہ دونو ایک دوسرے سے قریب تر ہوتے گئے۔ دونو کے تعلقات میں ایک عجیب بانکپن پیدا ہو گیا۔ جذبات کا خروش تیز اور ہیبت ناک طوفان میں تبدیل ہونے کے بجائے نرم رو اور سبک خرام باد نسیم میں بدل گیا۔ ان دونو کی زندگی ایک دلفریب خواب بن گئی۔

انہوں نے دور دراز علاقوں کے سفر کئے۔ رقاصہ روز ایک نئے قہوہ خانے میں ہوتی اور یہی سفر کی سب سے بڑی کشش تھی۔ انہوں نے میکسیکو کا سفر کیا' ان کے جسم ہمرنگ شالوں میں لپٹے ہوتے تھے' لوگوں کو ان کے عجیب وغریب لباس پر بے انتہا تعجب ہوتا تھا۔ وہ اپنی راتیں ساحل سمندر پر گزارتے' پناما میں ان کے کوڑے بھی لگائے گئے بحرالکاہل میں پہنچ کر ان کا جہاز لوٹ گیا اور انہوں نے ایک چھوٹے سے جزیرے میں پناہ لی جو چڑیوں کے بیٹ سے ڈھکا ہوا تھا' انہوں نے گھنے گھنے جنگلوں کو پیدل پار کیا جہاں انہیں قدم قدم پر سانپوں اور زہریلے کیڑے، مکوڑوں کا

مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔ ایک جگہ انہیں کھیت کاٹ کر اور مزدوری کر کے اپنا پیٹ بھرنا پڑا قصہ مختصر کوئی تجربہ، کوئی مشکل، کوئی دلچسپی دنیا میں ایسی نہ تھی جس میں وہ دونو ساتھ نہ رہے ہوں۔

لیکن اس کے بعد ہی رقاصہ کے لئے نئی مصیبتوں کا آغاز ہوا۔ اسے اپنے فن میں کچھ نئے سبق لینے پڑے جن کی حیثیت نقالی اور نٹ پنے سے زیادہ نہیں معلوم ہوتی تھی۔ اس نے اس تیزی سے ترقی کر لی تھی کہ اب اس کے لئے کوئی نئی چیز بہت ہی مشکل ہو گئی تھی لیکن یہ اندیشہ بھی پیدا ہو گیا تھا کہ اس کی کامیابی کہیں اسے فارغ نہ بنا دے اور اس میں آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کی صلاحیت بالکل ختم ہی ہو کر نہ رہ جائے۔ پٹو نے زدوکوب تو کبھی نہیں کی لیکن اس کے لہجے میں اتنا طنز پیدا ہو گیا تھا جس کے اثرات زدوکوب سے کم نہ تھے۔

اکثر ایسا ہوتا کہ کسی رقص کے بعد رقاصہ جب اپنے کمرے میں واپس جاتی تو پٹو کو ایک کونے میں بیٹھا لاپروائی سے سیٹی بجاتا ہوا پاتی۔ رقاصہ کو فوراً معلوم ہو جاتا کہ اس کے کیا انداز ہیں اور اکثر جلا کر کہتی،۔

"یہ کیا! تم آخر یہ کر کیا رہے ہو؟"

"کچھ نہیں میری مُنّی۔ کچھ بھی تو نہیں۔"

"نہیں کچھ تو ضرور تھا ضرور کوئی ایسی بات ہوئی ہے جو تمہیں بُری لگی ہے۔ تمہیں عیب جوئی کے سوا اور آتا کیا ہے؟ ذرا مجھے بھی تو بتاؤ، بتلاتے

ایک دوسرے سے بے انتہا محبت کرتے تھے لیکن دونو میں سے ایک میں
بھی جذباتی ہیجان نام کو نہ تھا۔ اگر کبھی وہ رقاصہ کے جسم سے بہت قریب ہو
ہوجاتا تو رقاصہ کے چہرے پر ایک ہلکی سی گھبراہٹ نظر آتی اور ایسا معلوم ہوتا
کہ ایک ہلکا سا سایہ اس کے چہرے پر نمودار ہو کر فضا میں کھو گیا۔ لیکن یہ عالم ہنُو کے
دل میں رقاصہ کی عزت وعظمت کا احساس اور بڑھا دیا کرتا۔ آپس میں تھوڑا تھوڑا
کھنچا رہنے سے وہ دونو ایک دوسرے سے قریب تر ہوتے گئے۔ دونو
کے تعلقات میں ایک عجیب بانکپن پیدا ہوگیا۔ جذبات کا خروش تیز اور
ہیبت ناک طوفان میں تبدیل ہونے کے بجائے نرم رو اور سبک خرام باد
نسیم میں بدل گیا۔ ان دونو کی زندگی ایک دلفریب خواب بن گئی۔

انہوں نے دور دراز علاقوں کے سفر کئے۔ رقاصہ روز ایک نئے
قہوہ خانے میں ہوتی اور یہی سفر کی سب سے بڑی کشش تھی۔ انہوں
نے میکسیکو کا سفر کیا' ان کے جسم ہمرنگ شالوں میں لپٹے ہوتے تھے' لوگوں
کو ان کے عجیب وغریب لباس پر بے انتہا تعجب ہوتا تھا۔ وہ اپنی راتیں
ساحل سمندر پر گذارتے' پناما میں ان کے کوڑے بھی لگائے گئے بحرالکاہل
میں پہنچ کر ان کا جہاز لوٹ گیا اور انہوں نے ایک چھوٹے سے جزیرے میں
پناہ لی جو چڑیوں کے بیٹ سے ڈھکا ہوا تھا' انہوں نے گھنے گھنے جنگلوں کو
پیدل پار کیا جہاں انہیں قدم قدم پر سانپوں اور زہریلے کیڑے مکوڑوں کا

مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔ ایک جگہ انہیں کھیت کاٹ کر اور مزدوری کر کے اپنا پیٹ بھرنا پڑا قصہ مختصر کوئی تجربہ، کوئی مشکل، کوئی دلچسپی دنیا میں ایسی نہ تھی جس میں وہ دو نو ساتھ نہ رہے ہوں۔

لیکن اس کے بعد ہی رقاصہ کے لئے نئی مصیبتوں کا آغاز ہوا۔ اسے اپنے فن میں کچھ نئے سبق لینے پڑے جن کی حیثیت نقالی اور نٹ پنے سے زیادہ نہیں معلوم ہوتی تھی۔ اس نے اس تیزی سے ترقی کر لی تھی کہ اب اس کے لئے کوئی نئی چیز بہت ہی مشکل ہو گئی تھی لیکن یہ اندیشہ بھی پیدا ہو گیا تھا کہ اس کی کامیابی کہیں اسے فارغ نہ بنا دے اور اس میں آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کی صلاحیت بالکل ختم ہی ہو کر نہ رہ جائے۔ پیُو نے زدوکوب تو کبھی نہیں کی لیکن اس کے لہجے میں اتنا طنز پیدا ہو گیا تھا جس کے اثرات زدوکوب سے کم نہ تھے۔

اکثر ایسا ہوتا کہ کسی رقص کے بعد رقاصہ جب اپنے کمرے میں واپس جاتی تو پیُو کو ایک کونے میں بیٹھا لاپروائی سے سیٹی بجاتا ہوا پاتی۔ رقاصہ کو فوراً معلوم ہو جاتا کہ اس کے کیا انداز ہیں اور اکثر چلا کر کہتی،

"یہ کیا! تم آخر یہ کر کیا رہے ہو؟"

"کچھ نہیں میری مُنّی۔ کچھ بھی تو نہیں۔"

"نہیں کچھ تو ضرور تھا ضرور کوئی ایسی بات ہوئی ہے جو تمہیں بُری لگی ہے۔ تمہیں عیب جوئی کے سوا اور آتا کیا ہے؟ ذرا مجھے بھی تو بتاؤ بتلاتے

ایک دوسرے سے بے انتہا محبت کرتے تھے لیکن دونو میں سے ایک میں بھی جذباتی ہیجان نام کو نہ تھا۔ اگر کبھی وہ رقاصہ کے جسم سے بہت قریب ہو جاتا تو رقاصہ کے چہرے پر ایک ہلکی سی گھبراہٹ نظر آتی اور ایسا معلوم ہوتا کہ ایک ہلکا سا سایہ اس کے چہرے پر نمودار ہو کر فضا میں کھو گیا۔ لیکن یہ عالم ہیُو کے دل میں رقاصہ کی عزت و عظمت کا احساس اور بڑھا دیا کرتا۔ آپس میں تھوڑا تھوڑا کھنچا رہنے سے وہ دونو ایک دوسرے سے قریب تر ہوتے گئے۔ دونو کے تعلقات میں ایک عجیب بانکپن پیدا ہو گیا۔ جذبات کا خروش تیز اور ہیبت ناک طوفان میں تبدیل ہونے کے بجائے نرم رو اور سبک خرام باد نسیم میں بدل گیا۔ ان دونو کی زندگی ایک دلفریب خواب بن گئی۔

انہوں نے دور دراز علاقوں کے سفر کئے۔ رقاصہ روز ایک نئے قہوہ خانے میں ہوتی اور یہی سفر کی سب سے بڑی کشش تھی۔ انہوں نے مکسیکو کا سفر کیا، ان کے جسم ہمرنگ شالوں میں لپٹے ہوتے تھے، لوگوں کو ان کے عجیب وغریب لباس پر بے انتہا تعجب ہوتا تھا۔ وہ اپنی راتیں ساحل سمندر پر گذارتے، پناما میں ان کے کوڑے بھی لگائے گئے بحرالکاہل میں پہنچ کر ان کا جہاز ٹوٹ گیا اور انہوں نے ایک چھوٹے سے جزیرے میں پناہ لی جو چڑیوں کے بیٹ سے ڈھکا ہوا تھا، انہوں نے گھنے گھنے جنگلوں کو پیدل پار کیا جہاں انہیں قدم قدم پر سانپوں اور زہریلے کیڑے، مکوڑوں کا

مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔ ایک جگہ انہیں کھیت کاٹ کر اور مزدوری کرکے اپنا پیٹ بھرنا پڑا قصہ مختصر کوئی تجربہ، کوئی مشکل، کوئی دلچسپی دنیا میں ایسی نہ تھی جس میں وہ دو نو ساتھ نہ رہے ہوں۔

لیکن اس کے بعد ہی رقاصہ کے لئے نئی مصیبتوں کا آغاز ہوا۔ اسے اپنے فن میں کچھ نئے سبق لینے پڑے جن کی حیثیت نقالی اور نٹ پنے سے زیادہ نہیں معلوم ہوتی تھی۔ اس نے اس تیزی سے ترقی کرلی تھی کہ اب اس کے لئے کوئی نئی چیز بہت ہی مشکل ہو گئی تھی لیکن یہ اندیشہ بھی پیدا ہو گیا تھا کہ اس کی کامیابی کہیں اسے فارغ نہ بنا دے اور اس میں آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کی صلاحیت بالکل ختم ہی ہو کر نہ رہ جائے۔ پٹو نے زدوکوب تو کبھی نہیں کی لیکن اس کے لہجے میں اتنا طنز پیدا ہو گیا تھا جس کے اثرات زدوکوب سے کم نہ تھے۔

اکثر ایسا ہوتا کہ کسی رقص کے بعد رقاصہ جب اپنے کمرے میں واپس جاتی تو پٹو کو ایک کونے میں بیٹھا لاپروائی سے سیٹی بجاتا ہوا پاتی۔ رقاصہ کو فوراً معلوم ہو جاتا کہ اس کے کیا انداز ہیں اور اکثر چلا کر کہتی:۔

"یہ کیا! تم آخر یہ کر کیا رہے ہو؟"

"کچھ نہیں میری منی۔ کچھ بھی تو نہیں۔"

"نہیں کچھ تو ضرور تھا ضرور کوئی ایسی بات ہوئی ہے جو تمہیں بری لگی ہے۔ تمہیں عیب جوئی کے سوا اور آتا کیا ہے؟ ذرا مجھے بھی تو بتاؤ بتلاتے

کیوں نہیں۔ میں تیار ہوں۔"

"نہیں۔ ننھی! کچھ بھی تو نہیں۔ تم سے تو جو کچھ ہو سکتا تھا تم نے کیا۔"

لیکن رقاصہ سے باتوں باتوں میں یہ کہہ دیا جاتا کہ اس کی فنی استعداد بہت محدود ہے اور ترقی کے بعض مدارج ایسے بھی ہیں جہاں وہ نہیں پہنچ سکتی تو وہ چڑ سی جاتی۔ اکثر اس کی آنکھیں نم ہو جاتیں اور پٹو سے کہتی "کاش میں تم سے کبھی ملی ہی نہ ہوتی۔ تم نے میری رگ رگ میں زہر بھر دیا ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ میں نے آج کا رقص جان بوجھ کر خراب کر دیا۔ تمہیں تو یہ سوچ سوچ کر خوشی ہوتی ہے۔ لیکن کبھی تو خاموش رہا کرو۔"

لیکن پٹو اسی طرح سے سیٹی بجاتا رہتا جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں پھر رقاصہ یوں کہتی۔

"مجھے خود اس کا احساس ہے کہ آج کے رقص میں کچھ خامیاں تھیں۔ اچھا تم یہاں سے چلے جاؤ۔ ہٹ جاؤ۔ میں تمہاری صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔ میرے لئے یہی کیا کم ہے کہ اتنی مشکل اداکاری کے بعد واپس آؤں تو تمہارا یہ طرز عمل ہو۔"

یکایک پٹو آتش فشاں پہاڑ کی طرح پھٹ پڑتا "تم نے فیدی والی تقریر کرنے میں اتنی تیزی کیوں کی۔"

یہ سن کر رقاصہ کے آنسو اور تیزی سے بہنے لگتے۔ "اے خدا! مجھے تو اب

موت ہی دے دے کبھی تو تم کہتے ہو کہ میں تیزی سے تقریر کروں اور کبھی کہتے ہو کہ آہستہ آہستہ۔ سال دو سال میں تم مجھے پاگل بنا دو گے۔ لیکن اچھا ہے مجھے نجات تو مل جائے گی"

لیکن ہٹو اسی طرح سے سیٹی بجاتا رہتا۔

"لیکن آج کی ایسی تعریف میری کبھی نہیں ہوئی۔ تم میری بات سُن بھی رہے ہو یا نہیں کبھی ہوئی تھی اتنی تعریف؟ تقریر تیزی سے کروں یا آہستہ آہستہ ان کے لئے سب برابر ہے۔ مطلب تو انہیں رلانے اور متاثر کرنے سے ہے۔ مجھ میں آج ملکوتیت آگئی تھی۔ اس کے علاوہ اور کیا چاہئے۔ اچھا اب خاموش ہو جاؤ۔ چپ رہو۔"

اور وہ بالکل خاموش ہو جاتا۔

"اچھا اب ذرا میرے بالوں میں کنگھا تو کر دو۔ لیکن اگر تم نے کچھ اور کہا تو میں پھر کبھی پارٹ نہیں کروں گی۔ تم کوئی اور لڑکی ڈھونڈ لو۔ میں تنگ آگئی ہوں۔"

ہٹو آٹھ دس منٹ تک اس کے بالوں میں اس طرح آہستہ آہستہ کنگھا کرتا جاتا جیسے وہ رقاصہ کی جگر دوز سسکیوں کو سن ہی نہیں رہا ہے۔ یکایک رقاصہ گھوم کر اس کا ایک ہاتھ پکڑ لیتی اور اس کا بوسہ لے لیتی۔ جیسے وہ پاگل ہو گئی ہے۔

"ہٹو! کیا میں نے واقعی آج پارٹ خراب کر دیا۔ کیا تمہاری عزت کو بٹہ لگ گیا۔ کیا میرا کام واقعی اس درجہ مایوس کن تھا کہ تم تھیٹر چھوڑ کر چلے آنے پر مجبور ہو گئے؟"

کچھ دیر خاموشی کے بعد پٹّو بڑے مصفعانہ انداز میں کہتا: "تمہاری جہاز والی اداکاری بہت اچھی تھی۔"

"چچا پٹّو! اچھی نہیں بلکہ بہت اچھی ہے۔ تمہیں وہ رات بھی یاد ہے جب تم کزکو سے واپس آئے تھے۔"

"آخر میں تو تم نے کمال ہی کر دیا۔"

"سچ!"

"میری مُنی! لیکن قیدی کی تقریر کے وقت تمہیں کیا ہو گیا تھا؟"

یہ سنتے ہی رقاصہ میز پر گر پڑتی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی اور پٹّو اس سے کہتا کہ ابھی تمہیں کمال حاصل کرنا ہے۔ اس کے بغیر کام نہیں چلے گا اس کے بعد پٹّو ایک گھنٹے تک پورے کھیل پر تنقید و تبصرہ کرتا رہتا۔ اس کے لہجے میں نرمی آ جاتی اور وہ تمام فنکارانہ پہلوؤں پر بحث کرتا۔ کس جگہ آواز کیسی ہونی چاہیئے۔ حرکات و سکنات اور زیر و بم میں کن باتوں کا لحاظ ہونا چاہیئے اور ان کا کیا معیار ہے۔ غرضیکہ وہ ہر طرح سے رقاصہ کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا۔ اور کبھی کبھی وہ تمام "کالدران" کے مکالموں پر رات بھر بحث کرتے رہ جاتے۔

وہ دو نو شہر شہر اور گانو گانو میں گھومتے پھر رہے تھے۔ لیکن ان کا مقصد ملک والوں کو خوش کرنا نہیں تھا۔ عوام تو بہت پہلے ہی آسودہ ہو چکے تھے۔

ان کے ذہن میں کمال اور پختگی کا ایک بلند اور اعلیٰ معیار تھا اور وہ تمام ملک کا دورہ صرف اس لئے کر رہے تھے کہ وہ بھی کمال اور عمدگی کا انتہائی درجہ حاصل کر لیں۔ ان کے سامنے ایک شمالی دنیا تھی، وہ خواب کو حقیقت میں ڈھالنا چاہتے تھے۔ لیکن ابھی تک غالباً وہ لوگ پیدا ہی نہیں ہوئے جو کسی شہ کار کو سمجھ سکیں یا اس سے لطف اندوز ہو سکیں۔

جوں جوں وقت گذرتا گیا۔ رقاصہ میں فن کی دلدادگی کم ہوتی گئی۔ کبھی کبھی اس کے دل میں اداکاری کے خلاف ایک شدید جذبہ نفرت پیدا ہو جاتا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے فن کی طرف سے لاپروائی برتنے لگی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ عورتوں کی اداکاری کو تمام کلاسیکی ہسپانوی ناٹک میں کوئی اہمیت حاصل نہ تھی۔ حالانکہ اسی زمانے میں انگلستان اور فرانس اور کچھ دنوں کے بعد وینس کے درباروں میں عورتوں کی اداکاری کی طرف خاص توجہ کی جاتی تھی اور اسے ہر حیثیت سے مکمل اور پُرکار بنانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ اس کے برخلاف ہسپانوی ہدایت کار اپنی تمام توجہ اپنے ہیرو کی اداکاری کو مکمل بنانے میں صرف کرتے تھے۔ ہسپانوی ناٹکوں میں ذہنی کشمکش اور اخلاقیات کو خاص دخل تھا۔ پُوکٹی سال تک ایسے ذرائع معلوم کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ جن سے رقاصہ اپنے کام میں زیادہ دلچسپی لینے لگے۔ ایک بار اسے رقاصہ سے یہ کہنا پڑا کہ بریرا کے نواب کی ایک پوتی پیدا ہوئی تھی۔ پُو اکثر رقاصہ سے شعرا کی عظمت بیان کیا کرتا تھا۔

اور رقاصہ کو بھی یہ ماننے سے انکار نہیں ہوا کہ ان کا درجہ بادشاہوں سے کچھ بلند اور ادبیا سے کچھ نیچا ہوتا ہے۔ انہوں نے نواب زادی کے سامنے کھیلنے کے لئے ایک شاہکار کا انتخاب کیا۔ ان کے دلوں میں عجیب ہیجان اور جوش تھا، اور انہوں نے امید و بیم کے عالم میں سیکڑوں بار اپنے پارٹ دُہرلئے۔ آخر وہ رات بھی آگئی جب رقاصہ کو نواب زادی کی موجودگی میں اداکاری کرنی تھی۔ پٹو نے رقاصہ کو پردے کی اوٹ سے ادھیڑ عمر کی نواب زادی کی صورت دکھلادی۔ اس کی صورت سے بزرگی اور خاندانی عظمت ٹپک رہی تھی۔ رقاصہ کو ایسا معلوم ہوا کہ دنیا کا تمام حسن اور عظمت اس میں سمٹ آئی ہے۔ وہ اتنی متاثر ہوئی تھی کہ جب اس کے اسٹیج پر جانے کا وقت آیا تو وہ پٹو کے گلے لپٹ گئی۔ وہ خاموش تھی۔ جذبۂ احترام اس کی رگ رگ میں گونج رہا تھا اور اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ کھیل کے درمیان میں جب وہ اسٹیج کے باہر چلی جاتی تو کہیں تنہائی میں بیٹھ کر دیوار کے کونوں کو گھورتی رہتی۔ کھیل ختم ہونے کے بعد پٹو بریا کی پوتی کو رقاصہ کے کمرے میں لایا۔ رقاصہ حیا اور مسرت کے جذبات کے ماتحت دیوار پر لٹکے ہوئے کپڑوں میں اپنا منہ چھپائے رو رہی تھی۔ پھر وہ اس کے قدموں پر گر پڑی اور پھر اس کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ عورت نے اسے اٹھایا اور اس کے ہاتھوں کو بھی بوسہ دیا۔ کھیل ختم ہو چکا تھا۔ لوگ اپنے اپنے گھر جا چکے تھے لیکن اجنبی عورت رقاصہ کے پاس بیٹھی اس سے اپنے خاندان کی روایات اور پرانی

باتیں بیان کرتی رہی۔

کمپنی میں ایک نئی اداکار آئی تھی۔ یُوں ان دنوں بہت خوش نظر آتا تھا لیکن جب رقاصہ نے اپنے مقابلے میں ایک نیا جوہر دیکھا تو اس کے دل میں انتہائی جوش اور ہیجان پیدا ہو گیا۔ یُوں جب ناظرین کی طرف پیٹھ کئے کھڑا ہوتا اور اس کے دل میں مسرت اور غصے کے جذبات موجزن ہوتے تو رقاصہ کی ہنسی ایسی معلوم ہوتی جیسے کسی سنگ مرمر کے چراغ میں بہت تیز روشنی ہو رہی ہو۔ رقاصہ دل میں عیاری یا بد طینتی کا خیال لائے بغیر اپنی مدمقابل کو نیچا دکھانے میں مشغول ہو گئی۔ اگر اسے کسی طربیہ میں کام کرنا ہوتا تو وہ مزاح اور مسرّت کا مجسمہ بن جاتی اور اگر حسب دستور اسے عورتوں کی نغو حرکات یا نفرت کے مناظر پیش کرنے ہوتے تو تمام لوگ اس کی لگائی ہوئی آگ سے جل اٹھتے تھے اس کی شخصیت میں ایک ایسا جادو پیدا ہو گیا تھا کہ اگر وہ کسی اداکار کے شانوں پر ہاتھ رکھتی تو تمام لوگوں میں ہمدردی کی ایک لہر دوڑ جاتی تھی۔ لیکن کمال کا یہ معیار وہ کبھی ہی کبھی حاصل کر سکتی اور جوں جوں اس کے فن میں نکھار پیدا ہوتا گیا اس کی اپنی اداکاری میں خلوص کی ضرورت بھی کم ہوتی گئی۔

رقاصہ بہت حسین تھی لیکن اس میں ایک عجیب نقص بھی تھا۔ اگر وہ بہت سنجیدہ اور متین ہوتی تو اس کی ناک لمبی اور پتلی معلوم ہونے لگتی۔ چہرے میں تھکن اور ایک حد تک بچپن کے آثار نظر آتے' اس کی آنکھوں سے ایک

عجیب بے اطمینانی ٹپکتی تھی اور وہ معلوم نہیں کیوں ایک دہقانی لڑکی معلوم ہونے لگتی تھی اور جیسے اس میں اتنی اہلیت ہی نہیں ہے کہ وہ اپنے فن کے تقاضوں، اپنے رجحانات، اپنے خوابوں اور اپنی زندگی کے معمولات میں کوئی توازن اور آہنگ قائم ہی نہیں رکھ سکتی۔ اس کی زندگی کا ہر پہلو اپنی جگہ پر ایک خاص حیثیت اور اہمیت رکھتا تھا اور اگر وہ اپنے آپ پر اتنا جبر نہ کرتی تو ان کے تقاضوں کا تصادم اسے اگر احمق نہ بھی تو حقیر اور بے حیثیت ضرور بنا دیتا۔ اس خارجی اور داخلی کشمکش کے باوجود بھی رقاصہ کو اداکاری کی صحیح لذت کا پورا پورا علم تھا اور وہ اکثر و بیشتر خود اپنے فن سے لطف اندوز ہوتی تھی۔ لیکن وہ محبت کی لذت سے ابھی تک ناواقف، اسے کسی نامعلوم منزل کی تلاش تھی۔ حالانکہ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ یہ راستہ کانٹوں سے اٹا ہوا اور انتہائی دشوار گذار ہے۔

ڈاں آندرے دَربیرا پیرو کا وائسرائے تھا۔ وہ ایک زمانے میں بڑا دلچسپ آدمی تھا۔ لیکن شراب نوشی، عیش و عشرت اور دس سال کی جلاوطنی نے اسے تباہ کر دیا تھا۔ جوانی میں وہ فرانس اور اطالیہ کے سفارت خانوں میں کام کر چکا تھا، آسٹریا میں متعدد لڑائیاں لڑ چکا تھا اور ارض مقدسہ کی زیارت بھی کر چکا تھا۔ اس کی شادی ایک بہت امیر عورت سے ہوئی تھی۔ لیکن وہ اسے جلد ہی داغ مفارقت دے گئی تھی، اس کے کوئی بچہ بھی نہ تھا اور اس

کی دلچسپیاں قدیم سکوں، قسم قسم کی شرابوں رقاصاؤں، خطابوں اور پرانے نقشوں تک محدود ہو کر رہ گئی تھیں حکومت، نے گھٹیا اور آرام طلبی نے تشنج کا مریض ——— اور اس کی امارت نے اسے بہت حد تک مغرور بنا دیا تھا کہ وہ کسی کی پوری بات نہیں سن سکتا تھا۔ جلاوطنی نے اس کی طبیعت میں ایک ایسی بیزاری پیدا کر دی جو اس کی شخصیت کو گھن کی طرح کھائے جاتی تھی، یہ ایک ایسا مرض تھا جو اس کے رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا۔ جو دن کو اس کی طبیعت پر ایک مستقل بوجھ بنا ہوا تھا اور راتوں کو اس کے خوابوں کو زہر آلود کرتا رہتا تھا۔ رقاصہ اپنی پھیکی اور بدمزہ زندگی اسی طرح تھیٹر میں گذارتی رہی اسے چند بار محبت کا تجربہ بھی ہوا لیکن ان تجربوں نے اس کی طبیعت کو اور بدمزہ کر دیا۔ اتفاق سے ایک بار اسے وائسرائے نے رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ رقاصہ اس کی صورت سے ہی اس درجہ متاثر ہوئی تھی کہ اس کے دل میں وائسرائے کی عظمت کا خیال گھر کر گیا تھا اور حکومت اور تھیٹر کی تمام روایات کو پس پشت ڈال کر اس کی پرستش شروع کر دی۔ اس کا خیال تھا کہ اب وہ تمام زندگی خوش رہے گی۔ آندرے نے رقاصہ کو بہت سی نئی باتیں سکھلائیں۔ رقاصہ یوں بھی بہت طباع تھی۔ اسے زندگی کے اس نئے تجربے میں ایک عجیب لذت معلوم ہوئی۔ آندرے نے اسے تھوڑی سی فرانسیسی بھی پڑھا دی، اس نے اسے صاف ستھرا رہنا اور بات کرنے کا

سلیقہ بھی سکھلا دیا۔ پٹو نے اسے سکھلایا تھا کہ اونچے درجے کی عورتیں کس طرح سے اپنی عزت کرا سکتی ہیں۔ آندرے نے اسے گھلنا ملنا سکھلا دیا۔ پٹو نے اس کے دامن کو ہسپانوی ادب کے جواہر پاروں سے مالامال کیا تھا' آندرے نے اس کا دامن چھوٹے موتیوں سے بھی بھر دیا۔

رقاصہ کی محل میں آمد و رفت نے پٹو کو بہت متفکر کر دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ محل میں جانے کے بجائے رقاصہ تھیٹر ہی میں چلتی پھرتی محبت کر لیا کرے۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ محل کی رسائی نے رقاصہ کے فن پر اور بھی جلا کر دی تو وہ خاموش ہو گیا۔ وہ اکثر اسٹیج کے پیچھے بیٹھ کر اس نظارے سے لطف اٹھاتا تھا کہ رقاصہ جن مناظر کو ناظرین کے سامنے پیش کر رہی ہے وہ خود بھی اس دنیا کی سیر کر چکی ہے۔ اس نے جام پکڑنے' الوداع کہنے اور کمرے میں داخل ہونے کے نئے انداز سیکھ لئے تھے۔ جو خود اس کی زندگی کی غمازی کرتے تھے۔ پٹو کو کسی اور چیز کی پروا بھی نہیں تھی اس کو سب سے بڑا اطمینان یہ دیکھ کر ہوتا تھا کہ ایک عورت ایک ہسپانوی شاہکار کو زندہ جاوید بنانے میں ممد ہو رہی ہے۔ اس کی اداکاری میں علمیت کا بھی دخل تھا۔ جس کے حرکات و سکنات میں زندگی کی تنقید نمایاں تھی' اور پھر رقاصہ الیسی حسینہ کی اداکاری جس کا لب و لہجہ جس کا حسن اور جس کی دلفریبی کا جواب دور دور تک نہ تھا وہ اکثر سوچتا کہ اس جوہر کو ہسپانیہ لے جانا چاہئے۔ کھیل ختم ہونے کے بعد

وہ رقاصہ کے سنگار کمرے میں جاتا اور کہتا "بہت خوب"۔ لیکن رخصت ہونے سے پہلے وہ اس سے قسمیں لے لے کر پوچھتا کہ اس نے "خوب" کہنے کا اتنا پر تصنع انداز کہاں سے سیکھا تھا۔

کچھ دنوں کے بعد والسرائے نے رقاصہ سے کہا کہ وہ شہر کے چند معززین کو رات کے کھانے پر مدعو کرنا چاہتا تھا اور وہ لاٹ پادری سے ملنا پسند کرے گی یا نہیں۔ رقاصہ کی مسرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ خود لاٹ پادری بھی اس سے مل کر بے انتہا خوش ہوا۔ اس نے پہلی ملاقات پر اسے ایک زمرد کا آویزہ بھی تحفتہً دیا۔

لیما کا لاٹ پادری ایک عجیب الخلقت انسان تھا۔ وہ بنفشئی رنگ کے ڈھیلے ڈھالے کپڑوں میں ملبوس ہوتا اس کا سر پھولا ہوا اور بہت بڑا تھا۔ اس کے ہاتھ موٹے موٹے اور چھوٹے سے تھے گوشت کے لوتھڑوں کے درمیان سے دو کالی کالی آنکھیں جھانکتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں جن سے الجھن رحم دلی اور بذلہ سنجی ٹپکتی تھی۔ لیکن اس گوشت کے لوتھڑے میں ایک آگہی طلب اور بے قرار روح پناہ گزیں تھی۔ وہ تیتر، ہنس، اور شراب کے تحفے بھیجنے والوں کے دل رکھکر اور ان کے تحائف کو شرف قبولیت بخش کر اپنی طبیعت کو اپنے قابو میں رکھنے کا دعوی کیا کرتا تھا۔ اسے گرجا اور اپنے فرائض سے بڑی محبت تھی اور وہ بڑا پارسا آدمی تھا۔ کچھ دنوں تک تو اس نے کافی مجاہدہ کیا اور اس نے اپنے جسم کو تکلیف دے دے کر اپنی روح کی پرورش کی۔ لیکن جب اس

سلیقہ بھی سکھلا دیا۔ پٹو نے اسے سکھلایا تھا کہ اونچے درجے کی عورتیں کس طرح سے اپنی عزت کرا سکتی ہیں۔ آندرے نے اسے گھلنا ملنا سکھلا دیا۔ پٹو نے اس کے دامن کو ہسپانوی ادب کے جواہر پاروں سے مالا مال کیا تھا، آندرے نے اس کا دامن جھوٹے موتیوں سے بھی بھر دیا۔

رقاصہ کی محل میں آمد و رفت نے پٹو کو بہت متفکر کر دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ محل میں جانے کے بجائے رقاصہ تھیٹر ہی میں چلتی پھرتی محبت کر لیا کرے۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ محل کی رسائی نے رقاصہ کے فن پر اور بھی جلا کر دی تو وہ خاموش ہو گیا۔ وہ اکثر اسٹیج کے پیچھے بیٹھ کر اس نظارے سے لطف اٹھاتا تھا کہ رقاصہ جن مناظر کو ناظرین کے سامنے پیش کر رہی ہے وہ خود بھی اس دنیا کی سیر کر چکی ہے۔ اس نے جام پکڑنے، الوداع کہنے اور کمرے میں داخل ہونے کے نئے انداز سیکھ لئے تھے۔ جو خود اس کی زندگی کی غمازی کرتے تھے۔ پٹو کو کسی اور چیز کی پروا ابھی نہیں تھی اس کو سب سے بڑا اطمینان یہ دیکھ کر ہوتا تھا کہ ایک عورت ایک ہسپانوی شاہکار کو زندہ جاوید بنانے میں ممد ہو رہی ہے۔ اس کی اداکاری میں علمیت کا بھی دخل تھا۔ جس کے حرکات و سکنات میں زندگی کی تنقید نمایاں تھی، اور پھر رقاصہ ایسی حسینہ کی اداکاری جس کا لب و لہجہ، جس کا حسن اور جس کی دلفریبی کا جواب دور دور تک نہ تھا وہ اکثر سوچتا کہ اس جوہر کو ہسپانیہ لے جانا چاہئے۔ کھیل ختم ہونے کے بعد

وہ رقاصہ کے سنگار کمرے میں جاتا اور کہتا "بہت خوب"۔ لیکن رخصت ہونے سے پہلے وہ اس سے قسمیں لے لے کر پوچھتا کہ اس نے "خوب" کہنے کا اتنا پرتصنع انداز کہاں سے سیکھا تھا۔

کچھ دنوں کے بعد والسرائے نے رقاصہ سے کہا کہ وہ شہر کے چند معززین کو رات کے کھانے پر مدعو کرنا چاہتا تھا اور وہ لاٹ پادری سے ملنا پسند کرے گی یا نہیں۔ رقاصہ کی مسرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ خود لاٹ پادری بھی اس سے مل کر بے انتہا خوش ہوا۔ اس نے پہلی ملاقات پر اسے ایک زمرد کا آویزہ بھی تحفتہً دیا۔

لی ما کا لاٹ پادری ایک عجیب الخلقت انسان تھا۔ وہ بنفشئی رنگ کے ڈھیلے ڈھالے کپڑوں میں ملبوس ہوتا اس کا سر پھولا ہوا اور بہت بڑا تھا۔ اس کے ہاتھ موٹے موٹے اور چھوٹے سے تھے گوشت کے لوتھڑوں کے درمیان سے دو کالی کالی آنکھیں جھانکتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں جن سے الجھن رحم دلی اور رندانہ سنجی ٹپکتی تھی۔ لیکن اس گوشت کے لوتھڑے میں ایک آگ کی طلب اور بے قرار روح پناہ گزیں تھی۔ وہ تیتر، ہنس اور شراب کے تحفے بھیجنے والوں کے دل رکھ کر اور ان کے تحائف کو شرف قبولیت بخش کر اپنی طبیعت کو اپنے قابو میں رکھنے کا دعوی کیا کرتا تھا۔ اسے گرجا اور اپنے فرائض سے بڑی محبت تھی اور وہ بڑا پارسا آدمی تھا۔ کچھ دنوں تک تو اس نے کافی مجاہدہ کیا اور اس نے اپنے جسم کو تکلیف دے دے کر اپنی روح کی پرورش کی۔ لیکن جب اس

نے محسوس کیا کہ فاقے کرنے اور روزے رکھنے کے مقابلے میں گناہ کرنے کے بعد خجالت اور ملامت نفس زیادہ ہوتی ہے تو وہ مختلف قسم کے کھانوں کے اجزائے ترکیبی اور روحانیت کو بلند کرنے میں ان کے اثرات کا مشاہدہ کرنے لگا اس نے مجاہدہ کرنے اور اپنے آپ کو تکلیف پہنچانے کا ایک نیا طریقہ معلوم کر لیا۔ اس نے ہر پہلو سے اپنی زندگی کو مثالی بنانے کی کوشش شروع کر دی۔

وہ تمام قدیم اور جدید ادبی شاہکاروں کو پڑھ کر بھلا چکا تھا۔ اور اس کے ذہن میں حسن کاری کا صرف ایک دھندلا سا عکس باقی رہ گیا تھا۔ وہ تمام آئمہ دین اور پیشوایان مذہب کی تحریروں کا غائر مطالعہ کر چکا تھا لیکن اس کو اس کے سوا اور کچھ یاد نہ رہ گیا تھا کہ غیر مقلدین کے لئے کیا فتوے صادر کئے جا سکتے ہیں اور انہیں کیا کیا سزائیں دی جا سکتی ہیں۔ حالانکہ پیرو میں ایک بھی غیر مقلد نہ تھا۔ اس نے تمام اطالوی اور فرانسیسی منکرِ اخلاق ادیبوں کے شاہکاروں کا مطالعہ کیا تھا اور تمام تصانیف دہ سال میں کم سے کم ایک بار ضرور دہراتا تھا اور جب ایک بار اسے پتھری کا مرض ہوا تب بھی اسے برانتومی اور آرتینو کے قصے بیان کرنے سے زیادہ کسی اور چیز میں لطف نہیں آتا تھا۔

اسے اچھی طرح سے معلوم تھا کہ پیرو کے تمام پادری بڑے پاجی اور بدمعاش تھے لیکن اس کا سدِ باب کرنے کے لئے اسے خود اپنی عیاشی کو خیرباد

کہنا پہلی شرط تھی۔ اس لئے وہ اپنے دل میں اپنے مشہور اقوال دُہرا کر اپنے آپ کو تسکین دے لیا کرتا تھا۔ مثلاً ظلم اور غم فانی ہیں۔ ترقی کا خیال صرف ایک خواب ہے، غریب چونکہ عیش و آرام کی لذت سے ناواقف ہیں اس لئے انہیں اپنی تیرہ بختی کا بھی احساس نہیں ہوتا۔ تمام امرا کی طرح غریبوں کی حالت دیکھ کر اسے بھی یہی خیال ہوتا کہ وہ اپنی فاقہ مستی ہی پر قانع ہیں۔ تمام متمدن آدمیوں کی طرح اس کا دعویٰ تھا کہ صرف پڑھے لکھے آدمی ہی کو اپنی غمزدگی کا احساس ہوتا ہے۔ ایک بار جب اُس کی توجہ اُس علاقے کے آدمیوں کی بداعمالیوں کی طرف مبذول کرائی گئی تو اسے مجبور ہو کر کچھ کرنا ہی پڑا۔ اسے بتلایا گیا۔ کہ اسے علاقے کے پادری کو اعلانِ نجات کے فرائض انجام دینے کے لئے اگر غلے کے دو پیمانے دیئے جاتے ہیں تو اپنے فرائض کو ٹال دیتا ہے اور اگر کوئی ان سے اچھی طرح کام لینا چاہے تو اسے پانچ پیمانے دینے پڑتے ہیں۔ یہ سن کر وہ غصے سے کانپنے لگا اس نے چلا کر اپنے سکرٹری سے کہا کہ وہ کاغذ اور قلم لائے تاکہ وہ عوام کے نام ایک عام پیغام لکھا دے۔ لیکن دوات میں روشنائی ہی نہ تھی اور تلاش کرنے پر تمام محل میں کہیں بھی روشنائی نہ مل سکی۔ اس لئے لاٹ پادری کو مجبور ہو کر اپنا ارادہ ترک کرنا پڑا۔ اپنے محل کی بدانتظامی کا اثر اس بیچارے پر اتنا ہوا کہ وہ بیمار پڑ گیا اور اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ پھر کبھی بلاوجہ غصہ نہ کرے گا۔

لاٹ پادری کو کھانے پر مدعو کرنے کا تجربہ اتنا کامیاب ہوا تھا کہ آندرے کے ذہن میں اور کئی نئے آدمیوں کے نام آنے لگے۔ وہ روز بروز پٹو کا دست نگر ہوتا جاتا تھا۔ لیکن اسے انتظار تھا کہ رقاصہ خود اسے مدعو کرنے کی تجویز کرے۔ کچھ دنوں کے بعد اپنے ساتھ کپتان اور اڈو کو بھی لایا۔ عام طور سے رقاصہ سب کے بعد بزم میں شریک ہوتی۔ کیونکہ اسے تھیٹر میں بھی جانا ہوتا تھا۔ وہ عام طور سے ایک بجے رات کو محفل میں پہنچتی۔ وہ اداکاری کے بعد بہت تھکی ہوتی لیکن وہ دیدہ زیب لباس اور خوشنما زیوروں میں ملبوس ہوتی تھی اس لئے اس کے چہرے میں ایک غیر معمولی دمک ہوتی تھی۔ چاروں آدمی اس کا استقبال اس طرح کرتے جیسے وہ کوئی ملکہ ہے۔ گھنٹہ سوا گھنٹہ تو رقاصہ خود بھی گفتگو میں حصہ لیتی۔ لیکن اس کے بعد رفتہ رفتہ وہ آندرے کے شانوں پر اپنا سر ٹیک دیتی اور خاموشی سے ان کی گفتگو سنتی رہتی اور خود اس میں کوئی حصہ نہ لیتی۔ وہ تمام رات باتوں میں گذار دیتے، ہسپانیہ کے لئے بے قرار دلوں کو تسکین دیتے رہتے اور یہ کہہ کہہ کر خوش ہوتے کہ ان کا اجتماع ہسپانیہ کے بڑے بڑے آدمیوں کے جمگھٹوں سے ملتا تھا، وہ جنوں اور غیب دانوں کی باتیں کرتے، یا ہبوط آدم سے پہلے کی زمین کے متعلق، یا آنے والے دنوں کے متعلق جب پودے اپنی مرضی کے مطابق ایک دوسرے سے ٹکرا سکیں گے، یا کیا انسان اس قابل ہو سکے گا کہ وہ روح کو دیکھ سکے اور مرتے وقت

کسی پرندے کی طرح جسمِ انسانی سے روح نکلتے ہوئے دیکھ سکے گا۔ وہ سوچتے کہ جب حضرت عیسیٰؑ دوبارہ یروشلم میں آئیں گے تو یہ خبر پیرو تک بہت دیر میں پہنچے گی۔ غرضیکہ وہ باتیں کرتے جاتے، لڑائیوں اور بادشاہوں کے متعلق شاعروں اور عالموں کے متعلق اور عجیب و غریب ملکوں کے متعلق، ان میں سے ہر ایک معلومات کا دریا بہا دیتا۔ علم و حکمت اور عشق و محبت کے قصوں کا ذخیرہ ختم کر دیتا اور انسان کے مستقبل پر چھوٹے آنسو بہا لیتا۔ سورج کی سنہری کرنیں محل کی محرابوں کو چومنے لگتیں اور رفتہ رفتہ دریچے کے راستے سے سارے کمرے میں اور خوابیدہ حسین رقاصہ کی پیشانی پر پھیل جاتیں۔ پھر یکایک تمام لوگ خاموش ہو جاتے، ہر شخص پہلے اُٹھنے میں تکلف کرتا تھا اور سب کی نظریں فتنۂ خوابیدہ پر مرکوز ہو جاتیں لیکن ہیُو کی نظریں تمام رات رقاصہ پر جمی رہتی تھیں اور سب کے ساتھ اس کی بھی تیز لیکن نرم اور متردد نظریں اپنی زندگی کے منبع پر جا کر ٹھہر جاتیں۔

ہیُو رقاصہ کے حرکات و سکنات پر ہمیشہ نظریں رکھتا تھا۔ اس نے دنیا والوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ ایک وہ جو محبت کر سکتے تھے اور دوسرے جو اس کی اہلیت ہی نہیں رکھتے تھے۔ جن لوگوں میں محبت کرنے یا اس میں مر مٹنے کا جذبہ نہیں ہوتا وہ محبت کو ہوس یا تعیش سمجھتے ہیں ہیُو ایسی زندگی اور ایسی موت دونو کو بیکار اور بدمزہ سمجھتا تھا۔ وہ انہیں ایسے

آدمیوں سے تشبیہہ دیتا تھا جن میں غصہ بھرا ہو جو دنیا کی فضا کو بیکار قہقہوں کھوکھلے آنسوؤں اور بے معنی باتوں سے آلودہ کر کے اپنی بے رنگ زندگی گزار دیتے ہیں۔ ان خیالات کے ماتحت اس نے محبت کا اپنا الگ تصور قائم کیا تھا جس میں خود اس کی عجیب زندگی کی طرح ایک تلخی اور پندار کی جھلک بہت نمایاں تھی۔ وہ محبت کو ایک مہلک بیماری سمجھتا تھا۔ یہ روگ ہر شخص کو نہیں لگ سکتا لیکن اگر کسی کو لگ جاتا ہے تو وہ بہت کچھ کھونے اور بدلنے کے بعد بھی زندگی اور اس کے مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کر سکتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ جو شخص محبت کے دشوار گزار راستوں کو کامیابی کے ساتھ طے کر لیتا ہے وہ عام طور سے ان غلطیوں کا مرتکب نہیں ہوتا جو دوسرے بہت سے لوگ کرتے ہیں۔ انہیں ابتدا میں بہت سی ناکامیوں اور ناامیدیوں کا منہ بھی دیکھنا پڑا لیکن انہیں اتنا معلوم تھا کہ زندگی کا مقصد صرف طویل عیش و عشرت ہی نہیں ہے اور انہوں نے کسی انسان کو خواہ وہ کتنا عالی وقار یا پست اور حقیر ہو صرف ایک میکانکی مخلوق نہیں سمجھا۔ ہیو نے رقاصہ کے حرکات و سکنات پر اسی طرح نظر جاری رکھی کیونکہ اس کے خیال میں اس میں کبھی باضابطگی آئی ہی نہیں تھی۔ رقاصہ اور وائسرائے کی ملاقات کے بعد کئی سال تک وہ بڑی پابندی اور انہماک کے ساتھ ایسا کرتا رہا۔ رقاصہ تین بچوں کی ماں بھی بن

گئی لیکن اس میں کوئی تبدیلی نہیں پیدا ہوئی۔ پٹو کو معلوم تھا کہ زندگی میں داخل ہونے کے بعد رقاصہ جس طرح سے متاثر ہوگی اس کا سب سے نمایاں اثر اس کی اداکاری کے بعض مخصوص پہلوؤں پر پڑے گا۔ اور یہ حقیقت تھی کہ بعض موقع پر وہ اس سادگی اور آسانی سے اداکاری کے مشکل لمحوں پر عبور حاصل کر لیتی کہ لوگ حیرت کرتے رہ جاتے۔ ایسے موقعوں پر خود رقاصہ بھی دل ہی دل میں بے انتہا خوش ہوتی۔ کیونکہ وہ موقعے ایسے ہوتے تھے جن میں خود اس کے نکھرے ہوئے مستقبل کی طرف اشارہ ہوتا تھا۔ لیکن اس قسم کی اداکاری کے وقت اگرچہ اسے الجھن نہ ہوتی تھی تب بھی عام طور سے ایسے موقعوں پر وہ عجلت سے کام لے کر جلدی جلدی اپنا پارٹ ختم کر دیتی۔ رقاصہ رفتہ رفتہ یہ محسوس کرنے لگی کہ آندرے میں وہ پہلی سی کشش باقی نہیں رہی اس لئے اس نے کئی بار چوری چھپے اداکاروں، نوّر افگنوں اور شہر کے تاجروں سے اظہار محبت بھی کیا۔

رقاصہ اب عام طور سے اداکاری میں بڑی عجلت اور بے دلی کا ثبوت دیتی۔ اس کے سر میں ایک نیا سودا سما گیا۔ اور وہ ایک باعزت خاتون بننے کے خواب دیکھنے لگی۔ معزز بننے کی تمنا اس کے دل میں اس حد تک گھر کر چکی تھی کہ وہ اکثر یہ کہا کرتی کہ اداکاری تو وہ صرف تفنن طبع کے لئے کرتی ہے۔ اس نے ایک استانی اور دو چار باوردی ملازم بھی رکھ لئے تھے اور فیشن کے طور پر گرجا بھی جانے لگی تھی۔ وہ یونیورسٹی اور دوسری درس گاہوں کے تقسیم انعامات کے

جلسوں میں بھی مدعو کی جانے لگی اور اس نے خیراتی کاموں میں دل کھول کر روپیہ دینا شروع کر دیا۔ اس نے تھوڑا سا لکھنا پڑھنا بھی سیکھ لیا تھا اور کسی شخص کے انداز سے یہ معلوم ہوتا کہ وہ اسے آزاد مشرب یا اوباش سمجھتا ہے تو وہ چڑ کر اس کی سختی سے تردید کرتی۔ رقاصہ روز بروز وانسرائے کے لئے عذاب جان ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے آندرے سے لڑ بھڑ کر اتنی آزادی حاصل کر لی تھی کہ وہ اپنی من مانی کر سکتی تھی۔ ایک نئے عیب نے پرانے عیوب کی جگہ لے لی تھی۔ اُس نے اپنے چند بڑے بوڑھے اور بھائی بند بھی ایجاد کر لئے تھے۔ اپنے بچوں کے لئے زبانی جواز حاصل کر لیا تھا اور معزز خواتین سے مل جل کر اس نے سماج میں ایک کمزور مجہول اور نائب کسبی کی جگہ پیدا کر لی تھی۔ اس کا سارا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ ایک اداکارہ تھی لیکن تمام لوگوں کو اس بات کا اچھی طرح سے علم تھا کہ سینٹ جلاسیس، سینٹ جنے سیس، سینٹ مارگریٹ اور سینٹ پلاجیا بھی ایک زمانے میں دکا رہی تھے۔

سنتا ماریا کے قریب ہی پہاڑیوں کے دامن میں ایک پُر فضا سیرگاہ تھی آندرے نے فرانس کے دوران سفر میں بار بار یہ ارادہ کیا تھا کہ وہ کسی اچھی جگہ میں رہ جائے اور اپنی ایک الگ دنیا آباد کرے۔ سیرگاہ میں ایک معبد تھا، چند خوبصورت مکان بیلوں کی لڑائی کے لئے ایک اکھاڑہ اور فرانسیسی طرز پر لگے ہوئے چند باغات تھے۔ رقاصہ کو زندگی میں کبھی آرام نہیں نصیب ہوا تھا۔ اس لئے اس نے پہاڑیوں کے دامن میں ایک چھوٹا سا مکان بنوا لیا اور راتوں کی تھکی ہاری وہاں

کچھ دیر کے لئے آرام کر لیتی ــــــ خاتون ماریا نے اپنی مہیب جس کی عجیب انداز میں تصویر کھینچی ہے اور وہ تمام لوگ جو اشسرائے کے زیر اثر تھے اس سے ہمیشہ اظہار کرتے تھے۔ اس نے حاکم وقت کی قمار بازی کے حالات بھی قلمبند کئے ہیں وہ قمار بازی میں بے دریغ روپیہ صرف کرتا تھا اور اگر یہ روپیہ جمع کیا جاتا تو اس سے دنیا کا سب سے قیمتی کتب خانہ خریدا جا سکتا تھا۔ اس نے رقاصہ کے لڑکے ڈان جیمس کا بھی ذکر کیا ہے جیمس کی پیشانی اور آنکھیں بالکل رقاصہ کی آنکھوں ایسی تھیں اور اس میں اپنے باپ کی ایسی سیمابیت بھی تھی۔ وہ ایک جانور کی طرح ہر تکلیف کو برداشت کر لیتا تھا اور اگر کسی اور کو اس کا علم ہو جاتا تو وہ بے انتہا پریشان ہوتا۔ وہ بے انتہا خوبصورت تھا اس میں اتنی جاذبیت تھی کہ کوئی شخص اس کو دیکھ کر اس کے حال پر رحم کھانے کی ضرورت ہی محسوس نہ کرتا تھا۔ مصائب نے اس کے چہرے میں ایک عجیب رعب اور وقار پیدا کر دیا تھا۔ وہ اکثر بنفشئی رنگ کے کپڑوں میں ملبوس ہوتا اور اگر رقاصہ کہیں جانے لگتی تو وہ آس پاس کی ان عورتوں سے جو اسے بلا کر بات چیت کرنا چاہتی تھیں بچتا ہوا تھوڑی دور تک اس کے ساتھ ساتھ جاتا تھا۔ رقاصہ کبھی اس پر خفا نہیں ہوتی اور نہ اس کے ساتھ کسی معاملے پر بحث کرتی تھی۔ اکثر شام کے وقت جب تھوڑی تھوڑی دھوپ بھی ہوتی تو ماں بیٹے روشوں پر ٹہلتے نظر آتے ـــ رقاصہ اکثر سوچا کرتی کہ ممکن ہے اسے وہ درجہ کب حاصل ہوگا جس کے خیال ہی سے وہ اکثر دل ہی

دل میں خوش ہوا کرتی تھی جیسے نمازی ہوا اور دھوپ میں ٹہل کر خوش ہوتا اور
آسمان کے بادلوں کو دیکھتا رہتا کہ کب وہ سورج کو چھپالیں گے اور تھوڑی دیر
کے بعد سایہ ہو جائے گا۔ وہ دونوں ایسے معلوم ہوتے جیسے وہ کسی دور دراز ملک
سے راستہ بھول کر آ گئے ہیں۔ یا کسی پرانے کھیل کے کرداروں میں جان پڑ گئی
ہے اور وہ ابھی اپنے ماحول سے نا آشنا ہیں اور نہ انہیں اس ملک کی زبان آتی
ہے اور نہ ان کا کوئی یار مددگار ہے۔

رقاصہ نے تیس سال کی عمر میں اداکاری چھوڑ دی اور پانچ سال میں
اس نے سماج میں وہ درجہ حاصل کر لیا جس کی وہ متمنی تھی۔ روز بروز موٹی ہوتی
گئی پھر بھی ایسا معلوم ہوتا کہ وہ روز بروز خوبصورت ہوتی جا رہی تھی۔ اسے کپڑوں
کا بے انتہا شوق تھا اور اس کے سنگار کمرے میں جواہرات اور خوبصورت اور
رنگ برنگے کپڑوں کے انبار لگے ہوتے۔ اس کے ہاتھوں اور چہرے پر سنگھوں پوڈر
لگا ہوتا اور اس کے لبوں پر کبھی سرخ اور کبھی نارنجی رنگ ہوتا۔ اس کی بدحواسی
اور غضب ناکی پر اس کے لب و لہجے کی شیرینی نے پردہ ڈال دیا تھا۔ اس کا
زیادہ وقت صاحب ریاست یا صاحب خطاب بیواؤں کے ساتھ گذرتا تھا
شروع شروع میں تو اس نے بہو سے یہ کہہ دیا کہ وہ اس سے کھلے بندوں نہ ملا
کرے لیکن آخر میں وہ اس کی چوری چھپے کی ملاقات کو بھی پسند نہ کرتی تھی۔ اگر
وہ اس سے گفتگو کرتی تو اس کے لہجے سے ظاہر داری ٹپکتی اور ایسا معلوم ہوتا

کہ وہ اس سے جان چھڑانا چاہتی ہے۔ معلوم نہیں کیوں وہ اس سے نظریں ملا ہی نہ سکتی تھی اور موقع نکال نکال کر وہ اس سے خواہ مخواہ لڑتی تھی۔ پھر بھی پُو مہینے میں ایک بار ہمت کرکے رقاصہ کے پاس چلا ہی جاتا اور اگر وہ تب بھی اس سے جان بچاتی تو وہ ایک گھنٹہ اس کے بچوں کے ساتھ گذار کر واپس آ جاتا۔

ایک دن پُو رقاصہ کے گھر گیا اور خادمہ کے ذریعہ اس سے درخواست کی کہ وہ اس سے ملنا چاہتا ہے۔ رقاصہ نے اس سے کہلا بھیجا کہ وہ غروب آفتاب سے کچھ پہلے فرانسیسی باغوں میں اس سے ملے گی۔ پُو رقاصہ کے پاس اس وقت عجیب جذبات کے ماتحت گیا تھا۔ تمام اکیلے انسانوں کی طرح اس نے بڑی امیدوں سے رقاصہ سے دوستی کی تھی۔ وہ سڑکوں اور مکانوں پر لوگوں کو ہنستے بولتے گلے مل کر جدا ہوتے ہوئے اور ضیافت اور تفریح کے وقت ہنسی مذاق کرتے ہوئے دیکھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ایسا کرنے سے ان کی زندگیوں میں ایک عجیب سکون اور اطمینان پیدا ہو جاتا ہے۔ یکایک اس کے دل میں بھی رقاصہ سے ملنے کی تمنا پیدا ہوئی' وہ چاہتا تھا کہ رقاصہ اسے اپنے خاص انداز سے "چچا پُو" کہہ کر پکارے اور وہ ایک لمحے کے لئے لمحۂ رفتہ کو آواز دے سکے۔

فرانسیسی باغ شہر کے جنوبی حصے میں واقع تھے۔ ان کے پیچھے انڈیز

کے سر بفلک سلسلہائے کوہ دور تک پھیلے ہوئے تھے اور سامنے چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں لہروں کی طرح پھیلی ہوئی تھیں جن کے بعد ہی بحرالکاہل شروع ہوجاتا تھا۔ اندھیرا ہونے لگا تھا چمگادڑ اڑنے لگے اور زمین پر چھوٹے چھوٹے پتنگے اور کیڑے مکوڑے نکلنے لگے تھے۔ باغ میں چند لوگ اودھر اودھر اکیلے پھر رہے تھے۔ کوئی تو آسمان کو رفتہ رفتہ بے رنگ ہوتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ اور کوئی جنگلے پر جھکا ہوا وادی کے کسی چھوٹے سے گاؤں میں بھونکتے ہوئے کتے کی آواز سن رہا تھا۔ یہ کچھ بہت ہی عجیب وقت تھا صبح اور شام گلے مل رہے تھے۔ کسان گھر لوٹ چکے تھے اور تھوڑی دیر کے لئے گھر کے پالتو کتے سے کھیل رہے تھے۔ نوخیز لڑکیاں سب سے پہلے نکلنے والے ستاروں کو دیکھ کر اپنے ارمانوں کا خیال کر رہی تھیں لڑکے رات کے کھانے کے لئے آفت مچا رہے تھے۔ گھروں کی مشغول ترین عورتیں بھی ایک لمحے کے لئے کام چھوڑ کر کھیت سے لوٹنے والوں اور بچوں کی شوخیوں کو دیکھ کر مسرور ہو رہی تھیں۔

ہنّو ایک سنگ مرمر کی بنچ سے ٹیک لگائے رقاصہ کا انتظار کر رہا تھا۔ یکایک رقاصہ نمودار ہوئی۔ اس نے آتے ہی کہا۔

"معاف کرنا مجھے دیر ہوگئی۔ کہو کیا چاہتے ہو؟"

"تم ——————" وہ بولا

"میرا نام اب ڈونا کمیلا ہے۔ میں رقاصہ نہیں رہی۔"

"ڈونا کیلا۔ میری مراد ہرگز یہ نہیں ہے کہ میں تمہاری توہین کروں لیکن جب تم نے مجھے بیس سال تک ایک نام سے پکارنے دیا ہے تو میں چاہتا ہوں کہ ــــــ"

"اچھا جو چاہو کہو۔ جو چاہو۔"

"لیکن پہلے وعدہ کرو کہ تم میری بات اچھی طرح سنو گی اور پہلے ہی جملے پر اٹھ کر بھاگ نہ جاؤ گی۔"

رقاصہ یکایک جوش میں آگئی اور بولی "چچا پٹو پہلے میری بات سنو۔ اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ تم مجھے دوبارہ تھیٹر میں واپس لے جاؤ گے تو اس کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ مجھے اس سے نفرت ہے۔ سمجھے۔ تھیٹر۔ ہاں وہی پرانا تھیٹر۔ جہاں مجھے بے عزتی اور بدنامی کے علاوہ اور کچھ نہیں حاصل ہوا۔ تم اپنا وقت کیوں خراب کرتے ہو؟"

پٹو نے نرمی سے جواب دیا "اگر تم اپنے نئے دوستوں کے ساتھ خوش ہو تو میں ہرگز تم سے واپس آنے کو نہ کہوں گا۔"

رقاصہ نے تیزی سے جواب دیا "اچھا تو تم میرے نئے دوستوں کو پسند نہیں کرتے۔ لیکن ان کے بجائے تم کس سے میری دوستی پسند کرتے ہو"

"مجھے وہ وقت اب بھی یاد ہے جب ــــــ"

"میں کوئی اعتراض یا مشورہ سننے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہوں۔ خنکی

بڑھنے لگی ہے۔ اس لئے اب مجھے واپس جانا چاہئے۔ اب تم میرا خیال بالکل چھوڑ دو۔ مجھے اپنے دل سے نکال دو۔"

"پیاری خفا کیوں ہوتی ہو۔ مجھے بات تو کرنے دو۔ کیا دس منٹ کے لئے تم میری باتیں خاموشی سے سن لینا گوارا کرو گی؟"

معلوم نہیں کیوں وہ رونے لگی۔ پٹو گم سم تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا باتیں کرے۔ اس نے آخر کار سلسلہ کلام اس طرح جاری کیا "تم کھیل دیکھنے بھی نہیں آتیں۔ ہر شخص کو تمہاری کمی بہت بری طرح سے محسوس ہوتی ہے۔ اب کھیل دیکھنے والے بھی بہت کم آتے ہیں۔ اب "پرانا طربیہ" ہفتے میں صرف دو بار کھیلا جاتا ہے۔ ورنہ عام طور سے ایسے کھیل کھیلے جاتے ہیں جن کی حیثیت نقالی سے زیادہ نہیں ہوتی۔ ہر چیز سے ایک بچپن، بھونڈا پن اور نامعقولیت ٹپکتی ہے۔ کسی کو صحیح ہسپانوی بولنے کا سلیقہ بھی نہیں ہے کسی میں اتنی بھی تمیز نہیں ہے کہ اسٹیج پر چلنا کیسے چاہئے۔ گذشتہ بڑے دنوں میں جو کھیل کھیلا گیا تھا وہ کتنا کامیاب تھا کیونکہ تم بھی اس میں موجود تھیں اس بار پھر وہی کھیل کھیلا گیا لیکن اس میں کہیں بھی جان نہ تھی۔"

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ چند سفید سفید بادل بھیڑوں کے گلے کی طرح سمندر سے اٹھ کر وادیوں میں اڑنے لگے۔ رقاصہ نے اس کے پیر چھوڑے اور ایسا معلوم ہونے لگا جیسے وہ وہی بیس برس پہلے والی رقاصہ

ہے"۔ چچا پٹو۔ مجھے معاف کردو مجھ سے غلطی ہوئی۔ جمی بیمار پڑا ہے اور کوئی اس کی نگہداشت کرنے والا نہیں۔ اس کا چہرہ بالکل زرد پڑ گیا۔ لیکن چچا پٹو اب اگر میں تھیٹر میں واپس آجاؤں تب بھی کوئی فائدہ نہیں ہے۔ لوگوں کو صرف نقالی پسند ہے ہم نے بلا وجہ "ہراناطربیہ" زندہ جاوید بنانے کی کوشش کی۔ اگر لوگ پرانے شاہکار پسند کرتے ہیں تو وہ انہیں کتابوں میں پڑھ سکتے ہیں۔ عوام کے مذاق کو بدلنے کی کوشش بالکل بیکار رہے"۔

"تم کتنی عجیب عورت ہو! تمہاری اداکاری کے زمانے میں میں نے تمہارے ساتھ بڑی ناانصافی کی۔ اس کا سبب میری حماقت اور میرا غرور تھا۔ میں نے تمہاری اتنی تعریف کبھی نہیں کی جتنی تعریف کی تم مستحق تھیں۔ مجھے معاف کردو۔ تم بہت بڑی فنکار ہو۔ اگر تمہارا دل ان لوگوں میں نہ لگے۔ تو تم میڈرڈ جا سکتی ہو۔ تم وہاں بہت کامیاب رہو گی۔ تم ابھی جوان بھی ہو اور حسین بھی۔ باعزت زندگی گذارنے کے لئے ابھی بہت وقت پڑا ہے۔ ہمارا بڑھاپا نزدیک ہے موت ہمارے سر پر کھڑی ہے"۔

"نہیں میں ہسپانیہ ہرگز نہیں جاؤں گی۔ دنیا ہر جگہ ایک ہی ہی ہے لی ما اور میڈرڈ میں کوئی فرق نہیں ہے"۔

"لیکن اگر ہم کسی جزیرے میں جاکر آباد ہو جائیں تو لوگ تمہاری پرانی زندگی سے ناواقف ہوں گے وہ تم سے محبت کریں گے"۔

"چچا پُو۔ تمہاری عمر پچاس سال کی ہوگئی اور تم اب بھی ایسے جزیروں کا خواب دیکھ رہے ہو؟"

اس نے اپنا سر جھکا لیا اور آہستہ آہستہ کہنے لگا "مجھے تم سے محبت ہے اور ہمیشہ محبت کرتا رہوں گا۔ اس سے زیادہ شاید میں کچھ اور نہ کہہ سکوں۔ میرے لئے تمہیں پا جانا ہی بہت کافی ہے۔ تم میری زندگی کا سرمایہ ہو۔ تم اب ایک معزز اور امیر عورت ہو میں اب تمہارے کس کام آسکتا ہوں لیکن میرے بس میں جو کچھ ہے اس سے کبھی دریغ نہ کروں گا۔"

رقاصہ نے ہنستے ہوئے کہا "تم بھی بڑے بیوقوف ہو۔ بالکل بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ چچا پُو۔ یہ بال کیا تم نے دھوپ میں سفید کئے ہیں اس قسم کی محبت یا اس طرح کے جزیرے دنیا میں ناپید ہیں۔ ایسی باتیں تو صرف قصے کہانیوں میں مل سکتی ہیں۔"

اس کے چہرے سے پشیمانی ٹپک رہی تھی لیکن قائل وہ اب بھی نہ ہوا تھا آخر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور غمگین لہجے میں کہنے لگی "ہم یہ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں۔ خنکی بڑھتی جا رہی ہے۔ اب مجھے جانا چاہئے۔ مان جاؤ اب میں تھیٹر میں واپس نہیں آسکتی۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد وہ پھر بولی "اب کیا کرنا چاہئے........ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں۔ میں حالات سے مجبور ہوں اب میں ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹ سکتی مجھے اپنی موجودہ حالت پر قائم

رہنا پڑے گا۔ زیادہ سوچنا بیکار ہے۔ چچا ہٹو۔ میرا خیال اپنے دل سے نکال دو۔
مجھے معاف کر دو۔ میری خطا معاف کرنے کی کوشش کرو۔"

وہ ایک لمحے کے لئے ساکت کھڑی رہی۔ وہ اس سے کہنے کے لئے کوئی عجیب بات سوچ رہی تھی۔ بادل کے آگے کے ٹکڑے ڈھلوان تک پہنچ گئے تھے، ہر طرف تاریکی پھیل چکی تھی۔ نیچے ہوئے بادل بھی باغ کے کنارے تک پہنچ چکے تھے۔ وہ جبی' آندرے اور خود اپنے متعلق سوچ رہی تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اسے الفاظ ہی نہ ملتے تھے۔ یکایک اس نے جھک کر اس کا ہاتھ چوم لیا اور تیزی سے روانہ ہوگئی۔ لیکن ہٹو دیر تک بادلوں کے سائے میں بیٹھا خوشی سے جھومتا رہا اور جو کچھ ہو چکا تھا اس کا مطلب معلوم کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

یکایک تمام لی ہاہن یہ خبر مشہور ہوگئی کہ رقاصہ کے رجو بعد میں ڈونا مکیلا کے نام سے مشہور ہوگئی تھی) چیچک نکل آئی۔ چیچک ہزاروں آدمیوں کے نکلتی ہے لیکن اس خبر میں لوگ خلاف معمول دلچسپی لے رہے تھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ رقاصہ کا حسن جس کی وجہ سے وہ خود اپنے پرانے پیشے سے نفرت کرنے لگی تھی، ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا۔ پھر یہ افواہ اڑی کہ رقاصہ نے مضحکہ خیز طور پر سادہ زندگی بسر کرنے کی ٹھان لی ہے۔ یہ سن کر حاسدوں کی بن آئی۔ رقاصہ جیسے ہی چلنے پھرنے کے قابل ہوئی وہ شہر سے فوراً اپنے پہاڑی والے مکان میں منتقل ہوگئی۔ اس نے اپنے چھوٹے سے محل کو نیلام کرنے کا حکم دے دیا۔ اس نے اپنے تمام

جواہرات ان لوگوں کو واپس کر دئے جنہوں نے وہ جواہرات اسے دئے تھے اس نے اپنے تمام بیش قیمت کپڑے بھی بیچ دئے۔ رقاصہ کے مکان پر وائسرائے، لاٹ پادری اور چند دوسرے درباری اور رقاصہ کے مخلص پرستاروں کا ہجوم لگ گیا، وہ سب رقاصہ کے لئے کوئی پیغام یا تحفہ لاتے تھے۔ لیکن اس نے کسی کے پیغام کی پروانہ کی اور تحفے بلا کچھ کہے سنے واپس کر دئے گئے۔ اس کی بیماری کے بعد اس کی نرس اور خادماؤں کے علاوہ اس سے اور کوئی مل بھی نہیں سکتا تھا۔ ڈان آندرے نے اس سے ملنے اور اسے اپنے ارادے سے باز رکھنے کی بارہا کوشش کی لیکن اس کا اثر بھی الٹا ہی ہوا۔ رقاصہ نے اس کے جواب میں آندرے کو ایک بہت بڑی رقم اور ایک خط بھیجا۔ خط کے ایک ایک لفظ سے تلخی اور غرور ٹپکتا تھا۔

تمام حسین عورتوں کی طرح رقاصہ کا بھی یہی خیال تھا کہ لوگ اس کی عزت صرف اس کے حسن کی وجہ سے کرتے ہیں، اس لئے وہ سمجھتی تھی کہ اس کے حسن کی بہار لٹ چکنے کے بعد بھی اگر اس کی طرف کوئی شخص توجہ کرے گا تو صرف رحم و کرم اور سرپرستی کے خیال سے۔ وہ ہمیشہ سے یہ سمجھتی آئی تھی کہ اس سے ہر شخص پُرخلوص نہیں بلکہ صرف جذباتی محبت کرتا تھا اسی لئے وہ یہ بھی سوچنے پر مجبور تھی کہ اب اس سے کوئی شخص محبت کر ہی نہیں سکتا۔ اس کا خیال تھا کہ جذباتی محبت سے فراخ دلی اور تفکر، خوابوں کی دنیا اور شعر و نغمہ ضرور پیدا ہوتے ہیں لیکن اس کی بنیاد ہوتی صرف خود غرضی پر ہی ہے۔ محبت میں خلوص اور عقیدت صرف

اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب اس میں سر بازار رسوائی، کسر نفسی اور تضحیک و تشکیک کے اجزا بھی شامل ہو جائیں۔ جن لوگوں کے سر پر مصیبت کا پہاڑ نیا نیا ٹوٹتا ہے انہیں شکست اور حرماں نصیبی کا احساس ان لوگوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہوتا ہے جو تمام عمر مصیبت جھیلتے آئے ہیں۔ جوں جوں رقاصہ کے مخلصین اسے اپنے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش زیادہ کرتے گئے اس کے مزاج میں چڑچڑاپن بڑھتا گیا۔ چند دنوں تک یہ خبر گرم رہی کہ وہ دنیا کو چھوڑ کر خدا سے لو لگانے کا ارادہ رکھتی ہے لیکن بعد کی خبروں سے معلوم ہوا کہ اس کے ہر ارادے کی بنیاد صرف غصے اور احساسِ شکست پر تھی۔ جو لوگ اس سے قریب تر تھے انہیں اس کے احساس شکست میں ایک عجیب عبرت نظر آتی۔ اس کو یقین تھا کہ اس کی اور اس کے بچوں کی زندگی ختم ہو چکی تھی۔

اپنے مجنونانہ غرور کے ہاتھوں لوگوں نے اسے جتنے تحائف اور روپے پیسے دئے تھے۔ اس سے کہیں زیادہ چیزیں اس نے ان لوگوں کو واپس کر دیں افلاس کا خیال اس کی تنہائی اور مستقبل کی تاریکی میں اور بھی اضافہ کر رہا تھا۔ اب اس کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اپنے چھوٹے سے مکان میں اپنی تنہا اور تاریک زندگی گذار دے۔ وہ گھنٹوں بیٹھی سوچا کرتی کہ اس کے دشمن اس کے حال زار پر خوب ہنستے ہوں گے' وہ اکثر اپنے کمرے میں ٹہلتی ہوئی اور عجیب طرح سے چلاتی سنی گئی تھی۔

لیکن ہُو اب بھی مایوس نہ ہوا تھا۔ اس نے بچوں کی خدمت کر کے اس کی جائیداد کے انتظام میں ہاتھ بٹا کر اور اسے کچھ روپیہ قرض دے کر رفاصہ کے گھر میں جگہ پیدا کر لی تھی۔ لیکن رفاصہ کا اب بھی یہ خیال تھا کہ ہُو کا یہ سلوک صرف ترحم پر مبنی تھا۔ وہ اسے تلخ اور ترش باتیں کہتی اور ایسا معلوم ہوتا کہ وہ اس پر طعنوں کی بوچھار کر کے اپنے آپ کو تسکین دیتی تھی۔ ہُو رفاصہ سے اور زیادہ محبت کرنے لگا تھا۔ وہ رفاصہ اور اس کی اپاہج روح کو اور اچھی طرح سے سمجھنے لگا تھا۔ لیکن ایک واقعے نے ہُو کا رسوخ یکایک ختم کر دیا۔ اس نے ایک دن رفاصہ کے کمرے کا دروازہ یکایک کھول دیا۔

رفاصہ کا خیال تھا کہ اس نے دروازے میں چٹخنی لگا دی تھی۔ تھوڑی ہی دیر پہلے اس کے دل میں ایک احمقانہ امید پیدا ہوئی تھی۔ وہ غازے کا استعمال کر کے اپنے حسن کی بہار واپس بلانا چاہتی تھی۔ وہ دربار کی بنی ٹھنی بوڑھیوں کو دیکھ کر ہنسا کرتی تھی لیکن یکایک اسے خیال آیا کہ اتنے دنوں کی اداکاری آخر اس کے کس کام آئے گی۔ اس کا خیال تھا کہ اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا اس کا دل دھڑک رہا تھا، اس نے جلدی جلدی کانپتے ہاتھوں سے غازہ لگایا لیکن اس سے اس کے چہرے کا بھدا پن اور بڑھ گیا، اس نے آئینہ دیکھا تو اسے اندازہ ہوا کہ اس کی کوشش بالکل بیکار تھی، یکایک اس کی نظر دروازے پر پڑی تو اس نے دیکھا کہ ہُو متحیر کھڑا ہے۔ وہ تڑپ کر اپنی جگہ سے اٹھی، اس نے ہاتھ ایل سے ،

اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا۔ اس نے چلا کر کہا "نکل جاؤ میرے گھر سے نکل جاؤ۔ اب یہاں کبھی نہ آنا۔ میں تمہاری صورت نہیں دیکھنا چاہتی"۔

شرم اور نفرت سے مغلوب ہو کر وہ اس کے پیچھے دوڑ رہی تھی' اس کے ہاتھ میں جو چیز آئی اس کی طرف پھینک کر مار دیتی یہاں تک وہ زینے سے نیچے اتر گیا۔ اس نے نوکروں کو حکم دے دیا تھا کہ ٹپو اس کے گھر میں قدم نہ رکھنے پائے وہ ایک ہفتے تک اس سے ملنے کی تدبیریں سوچتا رہا آخر مجبور ہو کر وہ لی ما واپس چلا گیا۔ اس نے دل بہلانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن ایک بچے کی طرح وہ رقاصہ سے ملنے کے لئے تڑپتا ہی رہا۔ آخر کار اسے ایک ترکیب سوجھ گئی اور وہ نکل کھڑا ہوا۔

وہ ایک دن صبح ہونے سے پہلے رقاصہ کی کھڑکی کے عین نیچے جا کر لیٹ گیا۔ ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے لیٹ کر ایک نوجوان لڑکی کی آواز میں رونا شروع کر دیا اور چوتھائی گھنٹے تک یوں ہی روتا رہا۔ روتے روتے درمیان میں وہ چیخ اٹھتا لیکن اس نے اس بات کا خیال رکھا کہ اس کی آواز سے رقاصہ جاگ تو جائے لیکن اسے زیادہ غصہ نہ آنے پائے۔ ہوا سرد اور خوشگوار تھی۔ دھندلی دھندلی روشنی پہاڑ کی اوٹ سے جھانکنے لگی تھی۔ ستارہ صبح کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی نسیم سحر کے جھونکے نہر کی سمت سے آجاتے تو درختوں کے پتوں کے منہ سے ایک آہ نکل جاتی

تھی۔ یکایک اوپر کمرے میں روشنی ہوئی، کھڑکی کھلی اور لبادے میں لپٹا ہوا ایک سر نمودار ہوا۔

"کون ہے؟"

ٹپو خاموش رہا۔

رقاصہ نے بیتاب ہو کر دریافت کیا "کون ہے؟ آخر یہ کون رو رہا ہے؟"

"ڈونا کیلا! سرکار! ذرا یہاں آئیے۔"

"تم کون ہو۔ تمہیں کیا چاہیے؟"

"میں ایک مصیبت کی ماری ہوئی لڑکی ہوں۔ اسٹریلا میرا نام ہے۔ آپ آکر میری مدد کیجئے۔ کسی نوکر کو نہ بلائیے۔"

رقاصہ ایک لمحے کے لئے خاموش رہی۔ اس کے بعد اس نے "اچھا" کہہ کر کھڑکی بند کر دی۔ وہ فوراً نیچے آگئی۔ وہ ایک موٹا لبادہ پہنے ہوئے تھی جس کا دامن شبنم میں گھسٹ رہا تھا۔ تھوڑی دور چل کر وہ رک گئی اور کہا "میرے پاس آؤ۔ تم ہو کون؟"

ٹپو اٹھ کھڑا ہوا "میں ہوں ٹپو۔ معاف کرنا مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا تھیں۔"

"ہائے اللہ! مجھے آخر تم سے کب نجات ملے گی۔ میں کسی سے نہیں

مل سکتی۔ مجھے میں کسی سے باتیں نہیں کرنا چاہتی۔ سمجھ لو کہ میں مر گئی۔ اس سے زیادہ میں کچھ اور کہنا نہیں چاہتی۔"

"اس زندگی کے صدقے میں جو ہم نے ساتھ گزاری تھی۔ میں تم سے صرف ایک چیز مانگتا ہوں۔ اس کے بعد تمہیں اپنی منحوس صورت کبھی نہ دکھلاؤں گا۔"

"میرے پاس ہے کیا جو میں کسی کو دے سکوں۔"

"میں قسم کھاتا ہوں کہ اگر تم میری بات آج اور صرف آج سن لوگی تو میں پھر کبھی تمہیں تکلیف نہ دوں گا"۔ یہ سن کر رفاصہ دروازے کی طرف بڑھی اس لئے پٹو بھی مجبوراً اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ رفاصہ یکایک رک گئی۔

"اچھا بتاؤ کیا چاہتے ہو اس وقت بڑی سردی ہو رہی ہے۔ میری طبیعت بھی کچھ سست ہے۔ میں آرام کرنا چاہتی ہوں۔"

"جیمس کو ایک سال کے لئے میرے ساتھ رہنے دو۔ میں اسے پڑھاؤں گا اسے ہسپانوی سکھاؤں گا۔ نوکروں کے ساتھ رہ رہ کر وہ خراب ہو رہا ہے۔"

"یہ ناممکن ہے۔"

"اس کی زندگی کیوں تباہ کرتی ہو۔ وہ بڑا ذہین بچہ ہے۔ اسے پڑھنے کا بہت شوق ہے۔"

"وہ بیمار رہتا ہے اور تکلیف نہیں اٹھا سکتا۔ تمہارا مکان ہے کہ کباڑخانہ۔ وہاں رہ کر اس کی صحت اور بھی خراب ہو جائے گی۔ اسے یہیں رہنے دو۔"

"لیکن اب وہ پہلے سے بہت اچھا ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اپنا مکان صاف کرا لوں گا۔ میں اس کی خدمت کے لئے ایک نوکر رکھ لوں گا۔ آج کل وہ نوکروں کے ساتھ لگا رہتا ہے۔ میں اسے شریف آدمی بناؤں گا۔ اسے تیغ بازی اور گانا سکھلاؤں گا۔ اسے لاطینی پڑھاؤں گا۔ اس کے علاوہ ..." ...

"تم ماں کی ممتا سے اچھی طرح واقف ہو۔ یہ ناممکن ہے۔ تمہیں ایسی ہی باتیں سوجھتی رہتی ہیں۔ میرے اور میرے متعلقین کا خیال دل سے نکال دو۔ میری اور میرے بچوں کی زندگی جیسی بھی گذر رہی ہے گذرنے دو۔ تمہیں اس سے کیا۔ اب بلاوجہ میرے پاس کبھی نہ آنا۔ میں اب کسی انسان کی صورت نہیں دیکھنا چاہتی۔"

اس پر ہیٹو کو سختی سے کام لینا پڑا۔ اگر تم اس کے لئے تیار نہیں ہو تو میرا تمام روپیہ واپس کردو۔"

رقاصہ کچھ دیر گم سم کھڑی رہی۔ اس نے دل ہی دل میں کہا: "یہ زندگی ہے؟ زندگی نہیں بلکہ عذاب جان۔ مجھے موت کب آئے گی۔" ایک لمحے کے بعد اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا: "میرے پاس روپیہ کہاں۔ لیکن مجھ سے جتنا ہو سکے گا تمہیں دے دوں گی۔ ابھی دیتی ہوں۔ میرے پاس تھوڑے سے جواہرات باقی ہیں۔ اس کے بعد تو تم سے نجات مل جائے گی۔" اسے اپنی ناداری پر شرم آ رہی تھی۔ وہ چند قدم آگے بڑھی اور پھر مڑ کر کہا: "اب مجھے معلوم ہوا کہ تم برے،

سنگدل ہو۔ لیکن مجھے تمہارا روپیہ ادا کرنا چاہیئے۔"

"نہیں میں نے تو روپیہ صرف اس لئے مانگا تھا کہ تم سے اپنی بات منوا سکوں۔ مجھے روپیہ نہیں چاہیئے۔ لیکن جمی کو ایک سال کے لئے مجھے دے دو مجھے اس سے محبت ہے میں اس کی اچھی طرح نگہداشت کروں گا۔ تم خود جانتی ہو۔ کیا میں نے تمہارے ساتھ کبھی سختی کی ہے؟"

"تم بلا وجہ احسان جتا رہے ہو۔ احسان۔ احسان۔ تم میرے محسن ہو! تم تم! بہت خوب!! اب میں وہ رقاصہ ہی نہیں رہی تو احسان کیسا۔" کچھ دیر خاموشی رہی۔ رقاصہ کی نظریں ایک ڈوبتے ہوئے تارے پر جمی تھیں۔ اس کے دل میں درد ہو رہا تھا جیسے ساری دنیا کا غم اس کے دل میں سما گیا ہے۔ پھر وہ بولی: "اچھا اگر جمی تمہارے ساتھ جانے کو تیار ہو تو مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں ہے میں اس سے صبح باتیں کروں گی اور اگر وہ تیار ہو گیا تو دوپہر کے قریب وہ تمہیں سرائے کے پاس مل جائے گا۔ شب بخیر۔ خدا حافظ۔"

"خدا حافظ"

رقاصہ مکان کے اندر چلی گئی۔ دوسرے دن دوپہر کولٹر کا سرائے کے پاس موجود تھا۔ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے اور گندے تھے۔ وہ بغل میں کپڑوں کی ایک گٹھڑی دبائے تھا۔ چلتے وقت رقاصہ نے اسے جیب خرچ کے لئے ایک گنی دی تھی۔ اور ایک لعلِ شب چراغ۔ وہ دونوں ایک چھکڑے میں منزل

مقصود کی طرف روانہ ہو گئے۔ لیکن ہچکولوں نے لڑکے کا برا حال کر دیا تھا اس
لئے بٹو نے اسے اپنے کندھے پر بٹھا لیا۔ جب وہ پل کے قریب پہنچے تو جمی
دل ہی دل میں اس خیال سے پانی پانی ہوا جا رہا تھا کہ وہ لمحہ جب وہ دوسروں
سے دور ہو جائے گا قریب آتا جا رہا تھا۔ وہ اس خیال سے اور بھی نادم تھا کہ چچا
بٹو کی ملاقات اس کے ایک دوست سے ہو گئی تھی۔ اور جب وہ پل پر پہنچے تو
وہ ایک عورت سے باتیں کرنے لگا جس کے ساتھ ایک چھوٹی سی لڑکی تھی۔
چچا بٹو نے اس سے کہا کہ پل پار کرنے کے بعد وہ تھوڑی دیر رک کر آرام کریں
گے لیکن بعد میں اس کی ضرورت پیش نہیں آئی ۔

شاید یہ ایک منشا تھی

پل کو ٹوٹے مدتیں گذر گئیں۔ اب وہاں پتھر کا نیا پل بن چکا ہے لیکن وہ واقعہ ابھی تک لوگوں کو نہیں بھولا۔ بلکہ ایک ضرب المثل کے طور پر مشہور ہو گیا ہے اور لوگ اسے گفتگو میں استعمال کرتے ہیں۔ لی ما کے لوگ یوں کہتے ہیں: "بھئی میں منگل کو مل تو سکوں گا، کہیں پل نہ ٹوٹ جائے"۔ ایک نے کہا: "میرا بھانجا پل کے پاس جا بسا ہے" جب کوئی اس قسم کی بات کہتا۔ سننے والے زیر لب مسکرانے لگتے۔ اس کا مطلب دوسرا لیا جاتا گویا وہ موت کے کنارے بیٹھا ہے۔ پیرو کے کلاسکی ادب میں بعض نظمیں اس واقعہ پر لکھی گئی ہیں۔ مگر ان میں سے سب سے زیادہ قابل قدر یادگار راہب جیو پیٹر کی کتاب ہے۔

اس بات پر غور کرنے کے سیکڑوں طریقے ہیں۔ اگر راہب جیو پیٹر کا ایک دوست طالب علم سان مارٹن کی یونیورسٹی میں نہ ہوتا تو وہ کبھی اس طور سے اس واقعہ پر غور و فکر نہ کرتا۔ اس طالب علم کی بیوی ایک صبح جہاز پر سوار ہو کر ایک سپاہی کے ساتھ اسپین بھاگ گئی اور بے چارے طالب علم کے لئے دو ننھی منی لڑکیاں جھولنے میں چھوڑ گئی۔ راہب جیو پیٹر کی زندگی میں حس تلخی کا فقدان تھا۔ وہ اس طالب علم کی زندگی میں کافی تھی۔ چنانچہ اسے یقین تھا کہ ساری دنیا ہی خراب

ہے۔ اسی طالب علم نے راہب کے کانوں میں ایسی ایسی باتیں ڈالیں جن سے اس کے خیالات بدل گئے۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ راہب کے دل پر حادثات کا فوری اثر ہوتا۔ اس کی آنکھوں میں شکست اور ہزیمت کا احساس نمودار ہوتا۔ مگر وہ نہایت سکون سے ان باتوں کو سلجھاتا۔ وہ چاہتا تھا کہ ایمان لانے والوں پر ہر ایک بات کو عیاں کر سکے۔

وہ طالب علم بیان کیا کرتا کہ "نیپلز اور سسلی میں ایک ملکہ ہوا کرتی تھی۔ جس کے پہلو میں ایک رسولی تھی۔ جب وہ علاج معالجے سے مایوس ہوگئی تو اس نے اپنے ملک میں منادی کرائی کہ اس کی رعایا اس کی صحت کے لیے دعائیں کرے اور سارے ملک میں کپڑوں پر صلیب کاڑھ کر خیرات کئے جائیں۔ رعایا اُسے محبت کرتی تھی۔ رعایا کی دعائیں اور ملکہ کی مخلصانہ خیرات سب کچھ بیکار گیا۔ کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ وہ ایک پُرشوکت کمرے میں لیٹی رہتی اس کے سینے پر یہ الفاظ لکھے رہتے تھے۔ "مجھے کسی برائی سے ڈر نہیں لگتا۔"

ایمان اور دین پر ایسے ایسے طنزیہ فقرات سن کر راہب جیوپٹر کو یقین ہو گیا تھا کہ اب وہ وقت آگیا ہے۔ جب دنیا کو ثبوت کی ضرورت ہے۔ دنیا ہر بات کے لیے کھلم کھلا ثبوت چاہتی ہے۔ تاکہ یقین جو اُن کے اندر موجود ہے ثبوت کی روشنی سے چمک اُٹھے۔ ایک بار اس کے قصبے پیرٹو میں وبا پھوٹی بہت سے لوگ مر گئے۔ اس نے چوری چھپے ایک ایسا نقشہ تیار کیا۔ جس

سے پندرہ مرنے والوں اور پندرہ بچ جانے والوں کے کردار و چال چلن کا علم ہوسکتا تھا۔ ہر ایک روح کے لئے دس نمبر اس کی اچھائی' مذہبی فرائض کی ادائیگی میں مستعدی اور خاندان کے لئے مفید ہونے کے تھے۔ اس نقشہ کا ایک ٹکڑا درج ذیل کیا جاتا ہے۔

نام	اچھائی	خدا ترسی	فائدہ مندی
جی۔ الفانسو	۴	۴	۱۰
نینا	۲	۵	۱۰
بی۔ میبنول	۱۰	۱۰	۰
وی۔ الفانسو	۸	۱۰	۱۰
این۔ ویرا	۰	۱۰	۱۰

اس نے جیسا کہ خیال کیا تھا' معاملہ اس سے بہت مشکل نکلا۔ ہر ایک شخص قریب قریب زندگی کے مختلف شعبوں میں اقتصادی طور پر ناگزیر تھا۔ تیسرا خانہ سارے کا سارا بے فائدہ تھا۔ دو حالتوں میں نمبر دیتے وقت اسے منفی (-) نمبر دینے پڑے۔ وی الفانسو' این ویرا کی طرح محض بُرا ہی نہ تھا۔ بلکہ وہ برائی کا چرچا اور اس کی نشرو اشاعت بھی کرتا۔ صرف خود گرجے نہ جاتا' بلکہ دوسروں کو بھی جانے سے روکتا۔ این ویرا بُری تھی۔ مگر عبادت کرنے میں اپنی مثال آپ تھی۔ سارے جھونپڑے کا اسی پر دارو مدار تھا۔ ان افسوس ناک

اعداد و شمار سے راہب جیو پٹر نے ہر ایک کسان کے متعلق رائے قائم کی۔ اس نے مرنے والوں اور بچنے والوں کے نمبروں کا مقابلہ کیا تو اُسے معلوم ہوا کہ مرنے والے جینے والوں سے پانچ گنا زیادہ جینے کے حقدار تھے۔ یوں معلوم ہوا گویا یہ وبا گاؤں کے نیک لوگوں کو ختم کرنے کے لئے پھوٹی تھی۔ جب یہ نقشہ مکمل ہو گیا اور راہب کو نتائج کا پتہ چل گیا تو وہ بحرالکاہل کے کنارے گیا۔ اس نے اپنی ساری محنت کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے لہروں کے سپرد کر دیا۔ ایک گھنٹے تک وہ وہاں کھڑا ان بادلوں کو دیکھتا رہا۔ جو سمندر کے افق پر منڈلا رہے تھے۔ اس حسین منظر کو دیکھ کر اس نے تہیہ کر لیا کہ پھر کبھی اپنی فکر کو تجزیہ کرنے کی اجازت نہ دے گا۔ یقین اور حقیقت کے درمیان اتنا زیادہ بُعد ہے۔ کہ اس کا اندازہ کسی کو بھی نہیں۔

اس طالب علم کی ایک اور بھی کہانی ہے (اگرچہ یہ اتنی تلخ نہیں)
شاید اسی نے راہب جیو پٹر کو اکسایا کہ وہ پل کے ٹوٹنے پر تحقیقات شروع کرے
یہ طالب علم ایک دن لی ما کے بڑے گرجا کے احاطہ میں گھوم رہا تھا وہ ایک جگہ رکا اور ایک عورت کی قبر کا کتبہ پڑھنے لگا۔ وہ تحریر کو قدرے اونچی آواز میں دہرانے لگا۔ لکھا تھا: "وہ بیس برس تک اپنے گھر کی مسرت کا مرکز رہی۔ وہ اپنے دوستوں کی راحت تھی۔ جو بھی اُسے ملا۔ وہ اس کے حسن اور نیکی سے متاثر ہوا۔ اور اب وہ یہاں لیٹی خداوند کی آمد ثانی کا انتظار کر رہی ہے

طالب علم نے جب یہ الفاظ پڑھے تو اُسے بہت غصہ آیا اس نے کتبے سے نگاہیں اٹھائیں اور طیش میں آ کر کہا "شرم نہیں آتی، بے حیا کہیں کے۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ ہم اس دنیا میں اپنی خواہشات پوری کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کرتے پھر یہ بے غرضی کا ڈھنڈورا کیسا؟ دنیا سے بے تعلقی کا نقارہ پیٹ کر ہم کیوں ان چیزوں کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں؟"

اب وہ کتبہ لکھنے والوں کی سازش کو عیاں کرنا چاہتا تھا۔ اس عورت کو مرے بارہ برس ہی گذرے تھے۔ اس نے اس کے نوکروں سے دریافت حال کرنا شروع کیا۔ وہ عورت کیسی تھی۔ وہ اس کے بچوں اور عزیزوں سے ملا جہاں کہیں وہ گیا۔ عطر کی خوشبو کی مانند اس عورت کے خصائل کا ذکر باقی تھا۔ جب بھی اس کا ذکر کیا جاتا۔ ذکر کرنے والے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوتی جس میں درد کا احساس ہوتا۔ اس کے باوقار طور طریقوں کو بیان کرنے سے الفاظ قاصر تھے۔ اس کا ایک مشتاق پوتا جس نے اُسے دیکھا تک نہیں تھا جب یہ سنا کہ اس کی دادی اماں اتنی نیک تھی تو اُسے یقین نہ آتا تھا۔ طالب علم حیران رہ گیا اور بالآخر بڑبڑایا "جو کچھ میں نے کہا تھا وہ درست نکلا۔ یہ عورت ایک استثنیٰ تھی۔ شاید ایک استثنیٰ"

ان مرنے والوں کے حالات جمع کرتے وقت راہب جیوپٹر کو خوف تھا۔ کہ شاید ذرا سی فروگذاشت اُسے تحقیق کے صحیح راستہ سے ہٹا دے۔ جوں

جوں دیر ہوتی گئی اُسے یوں محسوس ہونے لگا کہ اس کے قدم روز بروز تاریک راستے پر بھٹک رہے ہیں۔ وہ تفصیلات جنہیں وہ کارآمد سمجھتا تھا اُسے دھوکا دے رہی تھیں۔ اس لئے اس نے یہ ساری تفصیلات محفوظ کرلیں۔ اس کا خیال تھا کہ وہ (یا کوئی اور زیرک آدمی) اس مسودے کو بیس بار پڑھے۔ تو یہ بے شمار واقعات خود بخود متحرک ہو کر یکجا ہونے لگیں گے اور ان کے سارے راز ظاہر ہو جائیں گے۔ خاتون ماریا کے باورچی نے راہب کو بتایا کہ خاتون کی خوراک صرف چاول مچھلی اور تھوڑا سا پھل تھا۔ اس نے یہ بات بھی درج کرلی۔ کیونکہ ممکن تھا کہ کسی دن خاتون کی روحانی صفات پر اس سے روشنی پڑ سکے۔ ایک صاحب روبا ؤ نے بتایا کہ خاتون اس کے ہاں دعوتوں پر بن بلائے آجایا کرتی تھی۔ اُسے چمچے چرانے کی عادت تھی۔ ایک دایہ نے جو شہر کے دوسرے سرے پر رہتی تھی، بیان کیا کہ خاتون ماریا اس کے ہاں آیا کرتی اور ایسے ایسے روگی سوالات پوچھا کرتی کہ مجبوراً مجھے دھکے دے کر اُسے باہر نکالنا پڑتا۔ کتب فروش کا کہنا تھا کہ لی ما میں صرف تین مہذب اشخاص تھے اور ان میں سے ایک خاتون تھی۔ مزارع کی بیوی کے نزدیک خاتون ہر وقت کھوئی کھوئی رہتی تھی۔ مگر تھی بہت اچھی مالکن۔ سوانح نگاری کا فن بھی کتنا مشکل ہے۔

راہب جیوپٹر کو معلوم ہو گیا کہ جن لوگوں کے بارے میں وہ تحقیقات کر رہا تھا۔ اُن کے نزدیک اور قریب رہنے والے لوگ اُن کے بارے میں

بہت کم جانتے تھے۔ صدر راہبہ نے پی پیتا کے بارے میں کافی کچھ کہا۔ مگر اس نے اپنی ان توقعات کا کوئی ذکر نہ کیا۔ جو اس سے وابستہ تھیں۔ رقاصہ تک پہنچنا شروع میں تو کافی مشکل رہا۔ لیکن بالآخر وہ راہب میں دلچسپی لینے لگی۔ چچا پٹو کا کردار جو کچھ رقاصہ نے بیان کیا وہ بالکل ان اطلاعات کے متضاد تھا جو اس وقت تک راہب نے ہم پہنچائی تھیں۔ اپنے بیٹے کے متعلق اس نے چند کنائے بیان کئے ان میں دکھ اور درد نمایاں تھا۔ اس لئے ملاقات فوراً ختم کر دینی پڑی۔ کپتان آنوراڈو' ایس نے بان اور چچا پٹو کے متعلق جو کچھ جانتا تھا اس نے بتا دیا۔ دنیا میں جو لوگ بہت کچھ جانتے ہیں۔ بہت کم جرات رکھتے ہیں۔

آیئے ہم ذرا راہب جیوپٹر کی کلیات سے الگ تھلگ ہو کر بات کریں وہ کلیات تو کہیں گئی نہیں، ہمارے پاس ہی ہیں۔ راہب جیوپٹر کے سامنے ایک ہی حادثہ کے دو پہلو تھے۔ ایک برائی جس کی وجہ سے تباہی آئی اور دوسرے نیکی جس سے وہ جلدی جنت سدھارے۔ زور اور دولت نے ایک شخص کو برباد کر دیا اور اس کی بربادی لوگوں کے لئے عبرت بنی۔ مگر اسی شخص کا انجام دیکھ کر شہریوں کی روحانیت بلند ہوئی۔ اور وہ شخص سرفراز گیا۔ لیکن راہب جیوپٹر اپنے ان دلائل سے مطمئن نہ ہوا۔ یہ ممکن تھا کہ خاتون اتنی لالچی نہ ہو۔ جتنا اسے بیان کیا گیا اور نہ چچا پٹو اتنا عیش پرست۔

یہ کتاب مکمل ہو گئی تو اسے منصفوں کے سامنے لایا گیا۔ منصفوں

نے اسے ملحدانہ قرار دیا اور فیصلہ ہوا کہ کتاب اور اس کے مصنف دونوں کو چوک میں جلایا جائے۔ راہب جیو پٹر نے اس فیصلہ کو تسلیم کیا اور کہا کہ اُسے اس تحقیقات پر شیطان نے اکسایا تھا۔ وہ آخری رات اپنے تہ خانہ میں بیٹھا سوچا کیا کہ اس کی زندگی میں کونسی بات تھی جس نے اُسے ان پانچ مرنے والوں کے ساتھ مرنے سے بچا لیا۔ وہ سرکش نہیں تھا۔ وہ گرجا کے تقدس کے لئے جان تک نثار کرنے کو تیار تھا۔ وہ ایک آواز کے لئے بے قرار تھا ایک آواز جو اس کی تصدیق کرے۔ اور کہے کہ جو کچھ وہ کر رہا تھا محض دین کے لئے تھا۔ اس نے سوچا کہ دنیا میں ایک بھی شخص ایسا نہیں جو اس پر یقین کرے۔ دوسرے دن علی الصبح جب لوگوں کا ہجوم ہوا تو سورج نے اپنی روشنی پھیلادی۔ مجمع میں کثیر حصہ ایسے لوگوں کا تھا جنہیں اس کی باتوں پر یقین تھا۔ وہ لوگ اُسے محبت کرتے تھے۔

اس کے گاؤں والوں نے ایک وفد بھیجا جس میں نینا (جس میں نیکی ۲ درجے خدا ترسی ۵ درجے اور فائدہ مندی ۱۰ درجے تھی) اور دوسرے لوگ شامل تھے۔ یہ لوگ بے چارے حیران و پریشان اور اداس کھڑے دیکھ رہے تھے اور اُن کا واعظ شعلوں کی لپیٹ میں تھا۔ اس وقت ہاں اس وقت بھی اس کے دل میں ایک خیال موجزن تھا۔ کہ سینٹ فرانسس کبھی اُسے مردود نہیں قرار دیں گے۔ اس نے سینٹ فرانسس کو پکارا۔ شعلے بڑھ کے

وہ مسکرایا اور مر گیا۔

اس دن موسم بالکل صاف اور گرم تھا۔ لی ما کے لوگ اپنی سیاہ آنکھیں پھاڑے بازاروں میں چل رہے تھے۔ یہ سارا قافلہ بڑے گرجے کی طرف رواں تھا۔ اُن کی نگاہیں سیاہ مخمل کے ڈھیر اور چاندی کی طرف لگی تھیں۔ بڑا پادری چوغے میں ملبوس اپنے تخت پر بیٹھا پسینہ پسینہ ہو رہا تھا کبھی کبھی وہ راگ کے توڑ اور سروں سے لطف اندوز ہوتا۔ سنگیت منڈلی جب دعائیہ نغمہ کے اوراق بدلتی تو اس پر وجد سا طاری ہو جاتا۔

بڑا پادری انڈ ریس اپنے مرتبے اور عہدے کا لباس پہنے جھکا، اس کا دل آزردہ اور دکھی تھا، وہ خوب جانتا تھا کہ سارا مجمع اُسے چوری چوری دیکھ رہا ہے۔ لوگوں کو توقع تھی کہ بڑے پادری کے احساسات بھی ویسے ہی ہیں جیسے بیٹے کی موت پر ایک باپ کے ہوتے ہیں۔ اُسے یہ معلوم کرنے کا اشتیاق تھا کہ آیا رفاصہ مجمع میں موجود تھی یا نہیں۔ وہ کبھی اتنی دور بغیر تمبا کو پیئے نہ گیا تھا۔ لیکن آج اُسے جانا ہی پڑا۔ کپتان آلوراڈو دھکم دھکا چوک سے باہر نکلا۔ اس نے میدان پر نگاہ دوڑائی۔ چاروں طرف سیاہ بال اور دھم بتیوں کی قطاریں اور لوبان کا دھواں نظر آ رہا تھا۔ وہ باہر جا رہا تھا۔ اس کے لبوں پر الفاظ خود بخود آ گئے "کتنا جھوٹ، کتنا دکھاوا ہے یہ سب کچھ۔" وہ چلتے چلتے سمندر کے کنارے پہنچا اور اپنی کشتی میں جا بیٹھا اور شفاف پانی

میں ٹکٹکی باندھے دیکھنے لگا۔ پھر بولا "ایس تے بان' جو ڈوب مرے وہ کتنے خوش قسمت ہیں"

پردے کے پیچھے صدر راہبہ اپنی لڑکیوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔ بہت رات گئے اس نے اپنے من مندر کا ایک بت توڑ دیا تھا اُسے صدمہ تو بہت ہوا اسی وجہ سے اس کا رنگ ابھی تک زرد تھا۔ مگر وہ اپنے ارادے پر مستحکم تھی۔ اس پر یہ حقیقت واضح ہو گئی تھی۔ کہ اس کا کام جاری رہے یا نہ رہے اس کی اُسے پروا نہ تھی۔ اس کے لئے اسی قدر کافی تھا۔ کہ وہ کام کرتی رہے۔ وہ ایک ایسی نرس تھی جس کی خدمت کے باوجود اس کا مریض کبھی شفایاب نہ ہوا۔ یا ایک پادری جو ہر روز قربان گاہ کے سامنے جا کر دعائیں مانگتا۔ مگر ان دعاؤں میں شامل ہونے والا اور کوئی انسان نہ تھا۔ اب پی پیتا کہاں جو اس کے کام کو وسعت دے سکتی۔ اب تو اس کا سارا کیا دھرا اس کے ساتھ کام کرنے والیوں کی کاہلی اور لاپرواہی سے برباد ہو جائے گا۔ اس کے لئے یہی کافی تھا۔ کہ پیپرو میں اس کے سینے لوث محبت کا ایک پھول شگفتہ ہوتے ہی مرجھا گیا۔ اس نے سر جھکا کر اپنی پیشانی کو ہاتھ کا سہارا دیا اور پنچم کے سُر میں گم ہو گئی۔ مگر اس کے لبوں پر جاری تھا "پی پیتا میری محبت کو اور رنگ اختیار کرنا چاہیے تھا۔ میری زندگی میں اور زیادہ صفات ہونی چاہییں تھیں۔ مگر میں تو دن رات کام ہی میں پھنسی رہی" اُسے کتنا افسوس

تھا اور اس کا دماغ دعا میں کھو گیا۔

کمیلا اپنے فارم سے روانہ ہو کر اس دعا میں شامل ہونے آئی تھی۔ اس کا دل خوف اور حیرت سے بھرا تھا۔ یہ آسمانی آواز تھی۔ تیسری بار آسمان سے اُسے پکارا گیا۔ پہلی آواز چیچک کی صورت میں آئی تھی۔ دوسری بار کی پکار جیسی کی بیماری بنی اور اب تیسری بار پل ٹوٹ گیا۔ بھلا یہ حادثات ہو سکتے تھے۔ وہ شرم سے دبی جا رہی تھی۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ گویا اس کی پیشانی پر الفاظ لکھے تھے۔ پھر محل سے وائسرائے کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ وہ اپنی دو بیٹیوں کو اسپین کے ایک خانقاہی مدرسہ میں بھجوا رہا ہے یہ سب ٹھیک تھا۔ اب وہ اکیلی تھی۔ اُس نے بلا ارادہ تھوڑا بہت سامان باندھا اور دعا میں شمولیت کے لئے شہر روانہ ہو گئی۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ ہجوم اس کے بیٹے اور چچا پیو کے بارے میں حیرت و استعجاب کا اظہار کر رہا ہوگا۔ وہ گرجے کی رسوم کی ادائیگی کے متعلق سوچنے لگی۔ پھر اُسے اس گہرائی کا خیال آیا جہاں اس کا پیارا بچہ اور دوسرے لوگ گر گئے اور پھر روز جزا کا تصور اس کے ذہن میں نمودار ہوا۔ جہاں ایک فرد کروڑوں مردوں کے درمیان کھو جاتا ہے۔ مرنے والوں کے نقوش آہستہ آہستہ مدھم ہونے لگتے ہیں اور اُن کی ذاتی خوبیاں بھول جاتی ہیں۔ آدھے سے زیادہ سفر وہ کر چکی تھی۔ وہ ٹوٹی رسے ولی کے پیچھے گرجا میں گھس گئی اور ایک ستون کے سہارے کھڑی سانس لینے کے لئے جھک گئی۔ وہ دل ہی دل میں اپنے دونوں پیاروں کی بہتری کی تلاش کرنے لگی۔ وہ منتظر تھی کہ اس کے دل میں

نہیں جان سکتی۔ سب کہا کرتے تھے کہ تم ایک بڑی خوبصورت رقاصہ ہو۔"

"ماں! ایسا نہ کہو۔ میں ایک گنہ گار ہوں مجھے ایسا نہ کہو۔"

"میری بچی! لو پانی پیو۔ دیکھا ہمارا باغ کتنا خوبصورت ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟ اب تم کبھی کبھی آیا کرو گی نا کسی دن تمہیں راہبہ جونا سے ملاؤں گی جو ان باغوں کی منتظمہ ہے۔ خانقاہ میں داخل ہونے سے قبل اس نے شاید کبھی باغ دیکھا بھی نہ ہوگا۔ وہ کانوں میں کام کرتی تھی۔ وہیں اونچی پہاڑیوں میں رہتی تھی۔ اب تو باغبانی کا سارا کام اسی کے سپرد ہے۔ اس حادثے کو ایک برس ہونے کو آیا ہے۔ میرے دو عزیز ضائع ہوئے۔ دو تو اس یتیم خانہ کے بچے تھے۔ مگر تمہارا تو اپنا بچہ تھا نا؟"

"ہاں ماں"

"اور ایک دوست بھی"

"جی ماں"

"مجھے بتاؤ ......"

اور تب کمیلا کی یاس کا سارا طوفان جو اس کے لڑکپن سے اس کے دل میں بند تھا۔ امنڈ آیا۔ اُسے آج راہبہ جونا کے فوارے اور پھولوں کے درمیان ایک محبت بھری آغوش میں سکون مل رہا تھا۔

لیکن یہاں ہیں اتنی کتابیں جن میں پل سے ٹوٹے بغیر لیتے ہی واقعات

درج ہوں؟ ان میں سے ہم ایک اور واقعہ منتخب کرتے ہیں۔

"آپ سے ایک خاتون ملنے آئی ہیں"۔ صدر راہبہ کے دفتر میں ایک راہبہ نے اطلاع کی۔

"ہوں!" صدر راہبہ نے کہا اور اپنا قلم رکھ دیا۔ "کون ہے وہ خاتون؟"

"میں انہیں جانتی تو نہیں۔ کہتی ہیں ابھی اسپین سے آرہی ہوں۔"

"جلدی کرو! انہیں اندر لے آؤ۔ وہ اندلس کے محتاج خانہ کی امداد کرنے آئی ہیں۔"

ایک سرو قد، خوب صورت نڈھال سی عورت اندر داخل ہوئی۔ یہ خاتون کلارا تھی۔ وہی لڑکی جو کبھی اتنی موزوں تھی اب بالکل بدل گئی۔ "ماں! کیا آپ مصروف ہیں؟ میں چند باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

"میری بچی! بالکل فارغ ہوں۔ شوق سے کہو۔ ذرا بوڑھی ہو گئی ہوں۔ حافظہ کمزور ہے۔ میں نے تمہیں کہیں دیکھا ہے۔"

"خاتون ماریا میری ماں تھی ......" خاتون کلارا کو شک گذرا کہ صدر راہبہ اس کی ماں کو اچھا نہ سمجھتی تھی۔ اس لئے اس نے سوچا کہ وہ اُسے اُس وقت تک بات کرنے نہ دے گی۔ جب تک اپنی ماں خاتون ماریا کے حق میں سب کچھ نہ کہہ لے گی۔ ندامت نفس کرتے ہوئے اس پر نقاہت طاری ہو گئی۔ آخر کار صدر راہبہ نے اُسے اپنی بپتا اور اپنے بیان کے متعلق بتایا۔ پھر کپکپاتی

آمد کا بھی ذکر کیا" ہم تمام ناکام رہے۔ ہر کوئی سزا چاہتا ہے۔ سب ہر قسم کا کفارہ دینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر میری بچی! کیا تم جانتی ہو کہ محبت میں ـــ مجھے کہنے دو ـــ لیکن محبت میں ہماری غلطیاں زیادہ دیر تک باقی نہیں رہتیں"؟

خاتون کلارا نے ماں کا آخری خط دکھایا۔ صدر راہبہ ان الفاظ کو پڑھ کر حیران رہ گئی۔ اس کے لبوں پر الفاظ آ آ کر پھیل جاتے۔ بھلا ایسے الفاظ (وہ الفاظ جنہیں تمام دنیا خوشی سے ادا کر رہی تھی) پی پیتا کی مالکن کے دل سے کیسے پھوٹ نکلے۔ اس نے اپنے تئیں حکم دیا " اب جان لو ـــ جان لو کہ آخر کار تمہاری ہر جگہ عزت ہونے لگی ہے"۔ اور ایک الھڑ لڑکی کی طرح خوشی سے اس کا رواں رواں ناچنے لگا۔ اسے نیا ثبوت مل گیا کہ جن نیک کاموں کے لئے وہ زندگی دے رہی تھی اسے دنیا قبول کرنے لگی تھی۔ "میری بچی! مجھ پر ایک کرم کرو گی؟ آؤ میں تمہیں اپنا کام دکھاؤں"۔

سورج غروب ہو رہا تھا۔ لیکن صدر راہبہ لالٹین تھامے ایک غلام گردش سے دوسرے غلام گردش میں اس کی راہ نمائی کر رہی تھی۔ خاتون کلارا دیکھ رہی تھی۔ بوڑھے اور جوان، بیمار اور اندھے۔ مگر ان سے زیادہ اس نے اس تھکی ہاری مستعد بوڑھی عورت کو دیکھا جو اسے راستہ دکھا رہی تھی۔ صدر راہبہ ایکا ایکی ایک تنگ رستہ میں رکی اور بولی "مجھے بار بار خیال آتا ہے کہ بہرے اور گونگوں کے لئے بھی کچھ کرنا چاہئے۔ میری خواہش ہے کہ کوئی مریض ان کے

لئے کوئی بولی سیکھے۔ ایسے معذور پیرو میں ہزاروں ہی ہیں۔ شاید تمہیں اس بارے میں کچھ علم ہو۔ کیا اسپین میں کوئی طریقہ نکالا گیا ہے؟ کسی دن ایسا ضرور ہوگا" پھر تھوڑی دیر بعد وہ کہنے لگی "میں پھر سوچتی ہوں۔ ان دیوانوں کے لئے کچھ کیا جائے۔ تم جانتی ہو میں بوڑھی ہوں میں وہاں نہیں جا سکتی جہاں ان چیزوں کا ذکر رہتا ہے۔ لیکن اس بارے میں جو کچھ معلومات مل سکتی ہیں میں اکٹھی کرتی ہوں اور مجھے یوں محسوس ہوتا ہے .... اسپین میں ایسے معذوروں سے اچھا سلوک کیا جاتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے یہ بھی ایک راز ہے جو ہم سب سے مخفی ہے۔ مگر ہے ہمارے نزدیک ہی، اسپین میں اگر تمہیں ان باتوں کے متعلق کچھ معلوم ہو تو فوراً مجھے بھی لکھنا .... شاید تم مصروف ہو جاؤ۔"

خاتون کلارا نے باورچی خانے تک دیکھ لئے۔ آخر کار صدر راہبہ بولی "اب مجھے اجازت دو، مجھے ایک بیمار کے کمرے میں جانا ہے۔ تاکہ اُسے چند الفاظ کہہ کر تلقین کر سکوں اور وہ سو جائے۔ یہ لوگ سو نہیں سکتے۔ میں تمہیں وہاں جانے کی تکلیف نہ دوں گی۔ تم ایسی جگہوں سے مانوس نہیں ہو کرب انگیز آوازیں اور بیمار صورتیں تم سے دیکھی نہ جا سکیں گی۔ اور اس کے علاوہ میں اُن کو اپنے ہی بچے سمجھ کر باتیں کرنے لگتی ہوں۔" اس نے سر اٹھایا اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی ایسی مسکراہٹ جس میں انکسار اور درد کی کسک نمایاں ہو۔ صدر راہبہ اچانک ایک لمحے کے لئے ایک کمرے میں غائب ہو گئی

اور جب واپس آئی تو اس کے ہمراہ اس کی ایک معاون راہبہ تھی - ایک ایسی عورت جس نے اپنا سب کچھ پل کے حادثے میں کھو دیا تھا - اور یہ رقاصہ بھی "یہ جا رہی ہے" صدر راہبہ بولی " اُسے شہر کے اس پار کچھ کام ہے - اب مجھے بھی جانا ہی ہوگا - ورنہ تمہاری میرا انتظار نہ کرے گی - ہماری باتیں تو جلد ختم نہ ہو سکیں گی"

لیکن خاتون کلارا دروازہ میں کھڑی تھی - صدر راہبہ اس سے باتیں کر رہی تھی - فرش پر اس کے پیچھے چراغ رکھا تھا - صدر راہبہ ایک ستون کے سہارے کھڑی تھی - بیمار قطاروں میں لیٹے چھت کی طرف ٹکٹکی لگائے اور سانس روکے پڑے تھے - اس رات وہ باتیں کرتی رہی - اُن لوگوں کی باتیں جو تاریکی میں تھے (وہ ایس تنے بان کا سوچ رہی تھی - وہ پی پیتا کا سوچ رہی تھی) اور جو اب واپس نہ آسکتے تھے - وہ جن کے لئے یہ دنیا اب ایک بے معنی شے تھی - اور وہ لوگ جو بستروں پر لیٹے لیٹے محسوس کر رہے تھے کہ وہ اس چاردیواری میں محبوس ہیں - جو صدر راہبہ نے ان کے لئے بنوائی تھی - اس کے اندر روشنی تھی - گرمی تھی - اور باہر تاریکی، یہ لوگ اس جگہ کو کسی قیمت پر بدلنے کو تیار نہ تھے - اگرچہ موت انہیں دکھ درد سے نجات دلا سکتی تھی - وہ یہ باتیں کر رہی تھی - مگر خیالات اس کے دماغ میں چکر لگا رہے تھے - اس نے سوچا " اگرچہ اب بھی ایس تنے بان اور پی پیتا کو

اس کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ کمیلا بھی صرف چچا پٹو اور اپنے بچے کو جانتی ہے
یہ عورت اپنے بچے کی ماں ہے۔ لیکن جونہی ہم مر جائیں گے ان پانچوں کی یادیں
بھی مٹ جائیں گی پھر ہمیں بھی لوگ چند دن محبت سے یاد کریں گے اور بھلا
دیں گے۔ لیکن محبت ہی کافی ہے۔ محبت کی ساری تحریکات اس محبت
کی طرف لوٹتی ہیں جن سے وہ پیدا ہوئیں۔ محبت کے لئے ہر ایک یاد ضروری
نہیں۔ زندگی ایک ملک ہے اور موت بھی اور ان دونوں کو محبت کا پل ملاتا
ہے۔ یہ پل جاودانی ہے اور زندگی کا مقصد ——————

گیلانی پریس لاہور میں چھپی اور یونیٹی پبلشرز-۲۱ میکلوڈ روڈ لاہور سے
اے بیدی صاحب نے شائع کیا